ہندوستان کا علمی دینی و اصلاحی

ماہنامہ دارالعلوم

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

سید محمد ازہر شاہ قیصر

مجید ۵۳

دارالعلو
جلد
دارالعلوم د
ہندوستان پاکستان
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
طابع وناشر سید محمد ازہر شاہ قی
مقام اشاعت دارالع

جلد ۷ — شمارہ ۱

دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی ماہنامہ

دارالعلوم

رجب ۱۳۷۳ھ مطابق اپریل ۱۹۵۴ء

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا الحاج محمد طیب صاحب مدظلہ

(مدیر)

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

چندہ سالانہ

ہندوستان و پاکستان سے :- پانچ روپئے سالانہ

ممالک غیر سے :- ۱۲ شلنگ۔ فی پرچہ ۸/

طابع و ناشر:- سید محمد ازہر شاہ قیصر یونین پرنٹنگ پریس دہلی
مقام اشاعت دارالعلوم دیوبند

فہرستِ مضامین

سید علی احمد کاتب
مارچ ۵۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

(سیّد محمّد ازہر شاہ قیصر)

ہمارے معاونین!

(۱) رسالہ دار العلوم کے قدیم کرم فرما مولانا بشیر احمد صاحب پسروری نے جو تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں عرصہ تک پاکستانی حکومت کے قید و بند کا شکار رہے، تین (۳) خریدار رسالہ کے لئے فراہم فرمائے ہیں، مولانا اب رہا ہو چکے ہیں اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہیں۔

(۲) مولوی عبد المجید صاحب فاضل دیوبند نے سیمل ڈھوڑا (مغربی بنگال) سے ایک خریدار عنایت فرمایا ہے۔

(۳) مولانا عبد القدیر صاحب نے کوہر ضلع ڈیرہ غازیخاں سے دو (۲) خریدار رسالہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں موصوف نے خود بھی رسالہ کی خریداری قبول کی اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی توسیع اشاعت کے لئے جدوجہد فرمائی۔

(۴) جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب ریواڑوی نے باغبانپورہ لاہور سے چار خریداروں کا چندہ مرحمت فرمایا ہے، احقر مدیر مولانا موصوف کی عنایات کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۵) مولانا موسیٰ ابراہیم بھام جی (فاضل دیوبند) نے جنوبی افریقہ سے رسالہ کے لئے دس (۱۰) خریداروں کا غیر ملکی چندہ مبلغ ۷۰ روپے عنایت فرمایا ہے، مولانا موصوف دار العلوم کے ایک مستعد خیر خواہ ہیں اور رسالہ کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں مدیر رسالہ سے اپنے بزرگانہ تعلق کی بنا پر بھی دلچسپی لیتے اور اس کار خیر کے لئے اپنے قیمتی اوقات صرف کرتے ہیں بارک اللہ فی سعیکم وجزاکم اللہ فی الدارین خیرا

(۶) اے، ایم چوتھیا اینڈ کمپنی میکا ڈوڈ اربپ نے ایک غیر ملکی خریدار کا چندہ بھیجا ہے۔ موصوف بیمار ہیں، ہم اپنے قارئین کرام سے ان کے لئے دعائے صحت کی درخواست کرتے ہیں۔

(۷) رسالہ دار العلوم کے معاون خصوصی جناب مولانا محمد امین صاحب نے ضلع ملتان سے چار خریدار رسالہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں مدیر بصمیم قلب مولانا موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۸) مولانا جان محمّد صاحب مدرس عربی گورنمنٹ ہائی اسکول (براستہ صادقیہ بہاولپور) نے چار قدیم خریداروں کا چندہ اور مبلغ چار روپے سال گذشتہ کے چار خریداروں کے اتمام چندہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں مولانا کی خدمت میں ادارۂ رسالہ کی طرف سے جذبات تشکر پیش کئے جاتے ہیں۔

(۹) دار العلوم کے ایک علمی فرزند مولوی محی الدین صاحب نے پورنیہ سے ایک خریدار کی پیشکش کی ہے۔

(۱۰) جناب قاسم علی صاحب ایڈوکیٹ نے رحیم یار خاں سے ایک خریدار بھیجا ہے۔

(۱۱) مولانا قاری نصیر احمد صاحب نے چک جھرہ ضلع لائلپور سے چھ (۶) قدیم وجدید خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔ مدیر مولانا کی پرخلوص عنایات کا شکریہ ادا کرتا ہے، موصوف اگر اپنے حلقۂ احباب میں سعی فرمائیں تو رسالہ کے لئے مزید خریدار فراہم فرما سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ رسالہ دار العلوم کی ضروریات پر بیش از بیش توجہ فرمائیں گے۔

(۱۲) مولوی عبد الحلیم صاحب نے برجوالہ ضلع منٹگمری سے ایک خریدار فراہم فرمایا ہے۔

کوائفِ دارالعلوم دیوبند

حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کے سفر!

۱۰ر فروری کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ سفر پر تشریف لے گئے، ۱۱ر فروری کو مدرسہ اسلامیہ باغ نگر بستی کے جلسہ میں شرکت فرمائی۔ ۱۲ر کا دن سمریاواں بازار (بستی) کے ایک جلسہ میں صرف ہوا۔ ۱۴ر اور ۱۵ر کٹھور (ضلع سورت) میں گذرے، کٹھور کے دوران قیام میں حضرت موصوف تھوڑی دیر کے لئے مولوی حکیم محمد ابراہیم صاحب راندیری اور حافظ احمد صاحب کی مزاج پرسی کے لئے راندیر (ضلع سورت) بھی تشریف لے گئے ہر دو حضرات بیمار ہیں۔ ۲۶ر فروری کو پھر دوسرا سفر فرمایا۔ جس میں دہلی، اٹاوہ، کان پور، بہرائچ، اسرائے میر، شوندرت (ضلع میرٹھ)، اور مراد آباد میں جمعیۃ علماء صوبہ یو۔پی کی کانفرنس کی صدارت فرمائی۔

ایک معائنہ!

نومبر ۱۹۵۳ء میں منیجر حاجی محمد یعقوب صاحب، غلام رسول صاحب کلکتہ سے، سید سلطان محی الدین صاحب بھیمی مدراس سے، نور محمد صاحب دہلی سے دارالعلوم میں تشریف لائے تھے،

چاروں حضرات کامیاب تاجر اور دیندار مسلمان ہیں، ذیل کی تحریر میں ان حضرات نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا:۔

"آج بعد دوپہر ہم نے مولانا سید مبارک علی صاحب نائب مہتمم کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند کا معائنہ کیا۔ مدرسہ کے انتظامات اور حالات کو نہایت درجہ تشفی بخش پایا، خصوصاً کتب خانہ ایک نہایت اہم اور قیمتی علمی خزانہ ہے جس کو دیکھکر اطمینان، اور رُوحانی فرحت حاصل ہوئی۔ یہاں کتابوں کا ذخیرہ اتنا زیادہ ہے کہ موجودہ عمارت نہایت ناکافی ہے، اس وقت اہم اور قیمتی کتابیں جگہ کی تنگی کے سبب فرش پر رکھی ہوئی ہیں مدرسہ کی اس ضرورت کے مدنظر محترم منیجر محمد یعقوب صاحب نے کتب خانہ کے اس حصّہ کی تکمیل سے متعلق معلومات طلب کیں جو ابھی تعمیر نہیں ہو سکا۔

اِس اسلامی درسگاہ کی موجودگی سے موجودہ زمانہ میں اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں کا مستقبل روشن نظر آتا ہے اللہ پاک ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کی قدر کریں اور مخلص کارکنوں کے ساتھ تعاون کرکے ماجور من اللہ ہوں"

امدادی عطیات!

(۱) کرنل سردار اقبال محمد خاں صاحب نے بھوپال سے طلبہ کے لئے سو کمبل عنایت فرمائے، جو ضرورت مند طلبہ میں تقسیم کئے گئے۔ — ۱۰۰ کمبل

(۲) جناب علی حسین معرفت اعجاز حسین صاحب باندرہ بمبئی۔ — ۵۰۰ روپے

(۳) جناب احمد حاجی موسیٰ سالوجی مرچنٹ کھلوڑ (ضلع سورت) — ۵۰۰ روپیہ (زکوٰۃ)

(۴) جناب یوسف احمد بھا بھا صاحب کھلوڑ (ضلع سورت) — ۱۰۰ روپیہ (عطا)

(۵) جناب اسماعیل پٹیل صاحب کھلوڑ (ضلع سورت) — ۱۰۰ روپیہ (عطا)

(۶) جناب عبدالرشید صاحب مین بازار محلہ فرنگ، لاہور۔ — ۱۵ روپے

خریداران رسالہ خط وکتابت اور فرمائش کے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ تعمیل میں توقف نہ ہو۔ (ناظم)

قسط ۱۸

مقالات

فلسفۂ نعمت و مُصیبت

حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب مدظلہ

آب اِس پر غور کیجئے کہ جس طرح کائنات بدن میں مُصیبت کے عموم اور متعدی ہونے کی علت یہ قوائے ادراک و احساس ہیں جن کے عموم و اشتراک سے مصیبت اور اُس کا تاثر بھی عام اور مشترک ہو جاتا ہے، اِسی طرح مُصیبت کے حدُوث اور آپڑنے کا سبب بھی کسی نہ کسی جہت سے بھی قوائے ادراک و احساس ہیں، اور وہ اِس طرح کہ ان قوائے مدرکہ کے علمی تقاضوں کی مخالفت اور اُن کے سمجھائے ہوئے علم کی خلاف ورزی سے ہی یہ آفات و مصائب اُبھرتی ہیں۔ اگر نفسِ انسانی ان سچے مخبروں کے علم و درایت کی روشنی میں رہ نوردی کرے تو اُس کے دست و بازو اور دل و دماغ کو کبھی بھی حقیقی کوفت اور مُصیبت کا سامنا کرنا نہ پڑے پس کائنات بدن کے دُکھ درد کی یہ مُصیبتیں درحقیقت ان قوائے ادراک کے علم و خبر اور احساس کا ثمرہ نہیں بلکہ ان علمائے بدن (قوائے ادراک و احساس) سے سرکشی اور اُن کے ادراک و اخبار کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہیں جو نفس کی جبلی جہالت و ظلمت اور بے علمی و بے اعتدالی سے نمایاں ہوتی ہیں اور یہ ایک قدرتی چیز ہے کہ جس مادہ سے کوئی فعل اُس کے مناسب سرزد ہوتا ہے تو اُس فعل سے اُس مادہ میں انبساط، پھیلاؤ اور رسوخ قائم ہو جاتا ہے اور جس مادہ کے خلاف اُس کی ضد سے کوئی فعل سرزد ہو تو اُس میں انقباض پیدا ہوتا ہے اور وہ سکڑ کر مضمحل ہو جاتا ہے مثلاً داد و دہش اور عطا و نوال کے افعال بلاشبہ مادۂ سخا میں انبساط پیدا کریں گے کہ وہ ہی اُن کی جڑ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پھول پتی اور برگ و بار کی زیادتی سے جڑوں میں بسط و انبساط ہونا قدرتی ہے کہ یہ برگ و بار اسی جڑ سے نکل کر آرہے ہیں۔ گویا جڑ ہی ہے جو اُن کے راستہ سے دُور دُور تک پھیلی ہوئی اور منبسط ہو رہی ہے۔ غرض اپنی فرع سے اصل کو توسّع و فرحت اور بسط و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ہاں اس کے بالمقابل داد و دہش سے بخل کے مادہ میں انقباض و اضمحلال کا ہونا بھی لازمی ہے کہ عطا و جود نہ صرف اس مادہ سے مناسبت ہی نہیں رکھتا بلکہ اُس سے منافاۃ کا تعلق رکھتا ہے اور ہر منافی سے شئے میں قبض و انقباض کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اِسی اُصول پر جب انسان سے عالمانہ اور عادلانہ افعال ظاہر ہوتے ہیں تو قدرتاً قوائے علم و ادراک میں انبساط رسوخ اور اس نفس کی طرف جُھکاؤ اور رُجحان بڑھتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر انسان سے ظالمانہ اور جاہلانہ حرکات سرزد ہوں گی اور یہ عدمی حرکتیں اپنے آثار و لوازم کے لحاظ سے اپنے متحرک عضو کے لئے مُصیبت ثابت ہوں گی تو اس سے کوفت اور انقباض بھی سب سے پہلے ان ہی قوائے ادراک کو پیش آئے گا۔ اور اُن میں ہی اولاً و بالذات اس ظالم و جاہل نفس کے خلاف غم و غصّہ کی لہر دوڑ جائے گی جو ان ہی کی شان کے مُناسب ہوگی۔ اور شفقت آمیز جھنجھلاہٹ بھی پیدا ہوگی، جو ان ہی کی نوعیت کے مطابق ہوگی۔ جس سے بالآخر یہ قوائے ادراک بدنی نظام کی مصلحت اور مفاد عام کی خاطر اس فساد زدہ عضو کے معالجہ کی طرف بالطبع متوجہ ہو جائیں گے اور اُسی اشتراکِ احساس کے ذریعہ جو ان قویٰ کے وسیلہ سے پُورے بدن میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ قویٰ اس فاسد عضو پر دوسرے اعضاء بدن کو مسلط کرنے پر مجبور ہوں گے تاکہ اس عضو کو اور اُس کے واسطہ سے باقیماندہ بدن کو اُس فساد سے بچا لیجائیں، خواہ اِس سلسلہ میں اس عضو کے ساتھ تمام اعضاء بدن کو کچھ نہ کچھ اذیت بھی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ مثلاً یہ قوائے ادراک بدن کے کسی فاسد اور گلے ہوئے یا زخم آلود عضو پر اپنے علم و تدبیر کی رُو سے

کبھی تو اسی بدن کے ہاتھ سے تیز اور جراثیم کش دوائیں چھڑکوا دیتے ہیں جن سے اس عضو میں آیا ہوا مادۂ فاسدہ سوخت ہو جائے۔ یا اُس عضو کو سخت بندھنوں سے جکڑوا کر اُس کی نقل و حرکت کی آزادی سلب کر لیتے ہیں تاکہ اُس کی جانب خون کا دوران کم ہو جائے، اور اس منحرف اور ناشکر عضو کو خزانۂ بدن سے جو قوت پہونچ رہی تھی اور اُس سے بجائے صحت کے مرض کو مدد مل رہی تھی وہ رُک جائے، یا بدذائقہ اور تلخ دوائیں خود اسی نفس کے ہاتھوں کام و دہن کی تلخی کے ساتھ جوف بدن میں اُتروا دیتے ہیں تاکہ مادۂ فاسدہ کا اخراج ہو کر اس عضو ماؤف اور باقی ماندہ اعضاء بدن کو مصیبت مرض سے چھٹکارا میسر آجائے۔ کہ انجام کی صحت آغاز کی اس تلخی اور کلفت کے بغیر میسر آنی ممکن نہیں ہوتی۔ اور یا پھر بعد مایوسی اس عضو ماؤف ہی کو کٹوا کر پھنکوا دیتے ہیں تاکہ اس عضو کا یہ مایوس العلاج مرض اور فساد دوسرے اعضاء تک سرایت نہ کر جائے اور ظاہر ہے کہ کائنات بدن کے مجموعی مفاد کے لئے ایک عضو کے جزوی نقصان کو گوارا کیا جانا علم وعقل کے خلاف نہیں بلکہ سرتاسر اُوسی کے مطابق ہے۔

غرض ایک خاص عضو کے مرض ومصیبت کے تدارک کے لئے خود اعضاء بدن ہی بتقاضائے نوعیت کاٹ تراش اور تصفیہ و تزکیہ کی طرف اُسی رشتہ احساس و ادراک سے دوڑ پڑتے ہیں جو اُن میں مشترک ہے۔ گویا یہی قوائے ادراک مرض ومصیبت کو بھی محسوس کرتے ہیں اور پھر یہی قوائے ادراک دوسرے اعضاء کو حرکت میں لاکر اس ماؤف عضو کی اصلاح وسیاست بھی کرتے ہیں، جو درحقیقت اُس کے تصفیہ اور پورے بدن کے مفاد کے لئے ہوتی ہے۔ ہاں پھر یہ قوائے ادراک اس معالجہ وتدارک اور اصلاح بدن میں صرف اعضاء بدن ہی کو استعمال نہیں کرتے بلکہ خارج بدن کے بھی تمام اُن وسائل کو حرکت میں لے آتے ہیں جن کو اس فساد میں اس جاہل و ظالم نفس اور بے شعور طبیعت نے استعمال کیا تھا۔ جراثیم کش دوائیں نباتات اور جمادات کی ہوتی ہیں گویا نباتات و جمادات بھی اس بدنی اصلاح کے لئے کھڑے کر دیئے گئے۔ اوپریشن کی چھریاں اور نشتر بہرحال معدنیات کی ہوتی ہیں گویا معدنیات بھی اصلاح کے سلسلہ میں لے آئے گئے۔ آگ اور گرم پانی سے اعضا کو تپا گیا یا داغ دیا گیا گویا عناصر بھی اصلاحی سلسلہ میں کھڑے کر دیئے گئے۔ خون فاسد چوسنے کے لئے جونکیں لگوائی گئیں گویا حیوانات کو اصلاح بدن کے سلسلہ میں لے لیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ اصلاح نفس کے سلسلہ میں ساری کائنات جمادات و نباتات و حیوانات وغیرہ میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ فساد نفس میں بھی یہی اجزاء جاہلانہ اور ظالمانہ طور پر استعمال کئے گئے تھے۔ اور جمادی، نباتی اور حیوانی غذاؤں نے ہی بدن کو قوت دے کر زنا و شراب وغیرہ جرائم کے لئے تیار کیا تھا۔ نباتات کے پھل پھول ہی شراب کی کشید میں کام آئے تھے، زر و جواہر ہی سے قمار بازی نے جنم لیا تھا، اور زرکشی کی تھی۔ پس جب یہ وسائل معاصی اور مظالم میں کام آئے اور گویا نفس انسانی نے اُن کی مدد سے ہی یہ مہلک لذۃ حاصل کی تھی جس سے وہ تباہ ہو گیا تو قدرتی طور پر سزا و تعزیر میں بھی ان کی شرکت ضروری تھی اور ناگزیر تھا کہ چور کے ہاتھ کاٹنے میں لوہا، بیت مارنے میں لکڑی دُرّہ زنی میں حیوانات کا چمڑہ، خون چوسنے میں حیوانات، آپریشن کرنے میں آہنی چھری۔ تلخ دواؤں میں نباتات و معادن، زانی کو سنگسار کرنے میں پتھر، اور پھانسی دینے میں قاتل نفس پر جلاد کے نفس کا تسلط کار فرما ہو، تاکہ جرم کے وسائل سزا کے بھی وسائل بنیں یا بالفاظ دیگر آلات جرم ہونے کے سبب مجرم کے ساتھ خود بھی سزا پائیں اور اپنے مقام سے گرا دیئے جائیں۔ غرض انسان اپنے ہی اجزاء بدن پر اُن کی بے اعتدالیوں کے سبب خود اپنے ہی دوسرے اجزاء بدن کو اُن کے تمام اندرونی اور بیرونی وسائل سمیت مسلط کرتا ہے تاکہ کائنات بدن کا فساد دُور ہو کر اُس میں نظام صالح پیدا ہو جائے اور یہ سب کچھ محض قوائے ادراک کے علم وحس کی بدولت ظہور میں آتا ہے۔ ورنہ اگر حواس خمسہ ظاہرہ اور حواس خمسہ باطنہ جو وجود کا اعلیٰ ترین حصہ ہیں اس مصیبت کا ادراک نہ کریں اور دوسرے اعضاء کو اس ادراک کے اشتراک سے ادراک نہ کرائیں جس سے فساد زدہ اجزاء کا معالجہ اور تدارک ہو تو نہ فاسد عضو ہی درست

ہوسکتا ہے نہ کائنات بدن میں نظام صالح ہی قایم رہ سکتا ہے، اور نہ ہی متعدی مصائب سے دوسرے اجزاء محفوظ رہ سکتے ہیں۔ پس کائنات انفس میں دفاع مصائب اور ادراک مصائب کا محور تو یہ قوائے ادراک ٹھیرتے ہیں اور وُرودِ مصائب کا ذریعہ قوائے طبعیہ ثابت ہوتے ہیں جن میں شعور و ادراک نہیں ہے۔ یعنی عدم علم سے تو مصائب آتی ہیں اور علم سے دفع ہوتی ہیں جبکہ اُس کے ساتھ عدل و اعتدال قایم ہو۔

یہ ہے انسانی وجود اور عالم انفس کا ایک بُنیادی نقشہ جس میں اعلائے وجود اسفل وجود پر اور بالفاظ دیگر بدنی جہان کا ملاء اعلیٰ، ملاء اسفل پر اور ملاء اسفل اجزاء بدن پر اپنا عمل کرتا ہے جس میں ما بہ الاشتراک اور ما بہ الربط اوپر سے نیچے تک صرف یہی ادراک و احساس ہے۔ مگر تفاوتِ مراتب تفاوت درجات اور تفاوت نوعیت کے ساتھ، جس سے لذۃ و کلفۃ پورے بدن میں سرایت کرجاتی ہے ٹھیک اِسی نہج پر اس آفاقی جہان کو بھی سمجھیے کہ اعضاء بدن کی طرح یہ کائنات بھی چھوٹے بڑے اجسام اور نمایاں اجزاء زمین و آسمان۔ بحر و بر۔ جماد و نبات۔ حیوان و انسان اور جن و ملک پر مشتمل ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ اجسام عظام خود اصل وجود نہیں۔ محض مظاہر وجود ہیں۔ اصل وجود یہاں بھی، اس جہان کے باطنی قویٰ ہیں جو ان ظواہر کو نشو و نما دیکر خود اُن میں جلوہ گر ہیں۔ اور یہی قوائے شعور و ادراک اس جہان میں وجود کا اعلیٰ ترین حصّہ ہیں جن کے طبعی ایماء و اشارہ پر یہ کائنات اور اس کے یہ چھوٹے بڑے اجزاء حرکت میں آتے ہیں۔ پھر اُسی انفسی عالم کی طرح یہاں بھی باطنی قویٰ ایک ہی نوعیت کے نہیں بلکہ دو ہی قسم کی قوتیں اس آفاقی عالم میں بھی کار فرما ہیں، ایک قوائے علم و ادراک، اور ایک قوائے عمل و اکتساب، جن کے لئے یہ بحر و بر وغیرہ بمنزلہ اعضاء و اجزاء کے ہیں جن کی ہیئۃ ترکیبی سے اس کائنات کا نام جہان اور عالم ہوا ہے۔ پس یہ عالم مجموعہ ہے قوائے ادراک، قوائے عمل اور اعضاء عمل کا۔ جن میں قوائے شعور و ادراک اس جہان کے وجود کا اعلیٰ ترین حصّہ ہیں جو اِس جہان میں محرکات اور دواعی پیدا کرتے ہیں۔ قوائے عمل متوسط درجہ کا وجود رکھتے ہیں جو قوائے علم سے متاثر ہوتے ہیں اور اعضاء میں مؤثر ہوتے ہیں، اور سب سے ادنیٰ درجہ کا وجود ان اجزاء کائنات کا ہے جو محض نمائشی ہے، اور صرف آنکھوں پر بار ڈالتا ہے خواہ وہ زمین و فلک ہو یا بحر و بر وغیرہ کہ انھیں سوائے تأثر اور کسی باطنی محرک کی تحریک سے حرکت کر لینے کے اور کوئی طاقت نہیں ملی۔ اِس لئے ان کا وجود سب سے زیادہ ضعیف اور کمزور ہے اور اسی لئے وہ رات دن فناء و بقاء اور تغیرات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ پھر ان قوائے ادراک میں چونکہ احساس و شعور کی نوعیتیں متعدد اور مختلف ہیں اِس لئے ہر حصّۂ ادراک کا ایک مخصوص محل اور مستقر بھی ہے جسے اُس نوع احساس کے مناسب ہی ہیئۃ بخشی گئی ہے۔ اور پھر اُس ہیئۃ کے مناسب ہی اُس کا ایک مخصوص اسم و لقب بھی ہے تاکہ اسم کے ذریعہ ہیئۃ کا اور ہیئۃ کے ذریعہ اُس نوع ادراک کا تعارف ہو سکے۔ جیسے مثلاً کائنات انفس میں قوائے احساس کی مختلف انواع سمع بصر۔ ذوق۔ شم اور لمس ہیں۔ ان پانچوں کے پانچ مستقر ہیں جن میں ان کا خزانہ مکنون ہے اور ان پانچوں محلات کے پانچ ہی مخصوص اسماء ہیں یعنی آنکھ۔ کان۔ ناک۔ زبان اور بدن جن کے ذریعہ ان کا تعارف ہوتا ہے۔ پس جب بھی کوئی آنکھ کا نام لیگا تو فوراً آنکھ کی بادامی ہیئۃ ذہن میں آجائے گی اور اس نام اور ہیئۃ سے پھر قدرتاً قوۃ بینائی کا تصوّر ذہن میں قائم ہو جائے گا کہ یہ اسم و رسم اسی قوۃ کے تعارف کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ قوۃ لامسہ سارے بدن میں پھیلا دی گئی ہے گویا اُس کے لئے سارے بدن کو ایک ہیئۃ بنا دیا گیا ہے کہ اُسے دیکھتے ہی چھُو دینے کا تصور بندھ جاتا ہے، اِسی طرح دوسرے قویٰ کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہر قوۃ کے مناسب ہی اُسے ہیئۃ دی گئی ہے جسے دیکھتے ہی اصل حقیقت کا تصوّر ذہن میں آجاتا ہے اور ہر ہیئۃ کا نام لیتے ہی اُس ہیئۃ کا دھیان قائم ہو جاتا ہے۔ بعینہ اِسی طرح کائنات آفاق میں بھی قوائے ادراک کی انواع پھر انواع کی ہیئات اور پھر ہیئات کے القاب و اسماء ہیں جو باہم متناسب ہیں کہ پیرایہ کے تصوّر سے حقیقت کا تصوّر

دل میں آجاتا ہے۔ بہرحال اتنا ہے کہ کائنات انفس میں ان انواع کی ہئیات اعراض کی صورت میں ہیں کہ کائنات انسانی، مجموعۂ اعراض ہے اور کائنات آفاق میں ان انواع کی ہئیات جواہر و اعیان کی صورت میں ہیں جو ان قوائے ادراک کا مظہر اتم ہیں کہ یہ جہان ہی اعیان ثابتہ کا جہان ہے۔ پس جیسی قوۃ ہے اُسی کی نوعیت کے مطابق اس کی ہیئۃ رکھی گئی ہے جو اس قوت کے تعارف کا ذریعہ اور اُس کے لئے مظہر اتم ہے۔ گویا اگر کوئی علم کی مختلف انواع اور عقل کلی کے متفاوت افراد کو متشکل دیکھنا چاہے تو وہ ان پیکروں کو دیکھلے اگر اُن کے دیکھنے کی بینائی رکھتا ہو۔ اور پھر ان مظاہر علوم و ادراکات کے مخصوص القاب و اسماء ہیں، پس عالم آفاق کے ان ہی قوائے ادراک و احساس کے خزانوں اور مخزنوں کو شریعت کی زبان میں ملائکہ کہتے ہیں۔ ان ملائکہ کے پیکر اُن ہی قویٰ کے مناسب شان ہیں جن کا وہ مظہر بنائے گئے ہیں اور پھر ان پیکروں کے مخصوص اسماء ہیں جیسے جبرئیل۔ میکائیل۔ اسرافیل اور عزرائیل وغیرہ۔ یہ درحقیقت علوم و کمالات کے حصص کے مجسم پیکر ہیں۔ جن کے ذریعہ علم و عقل کا تعارف ہوتا ہے اور جہاں سے علم و عقل تقسیم ہوا ہے۔ اور جیسے کائنات انسانی میں تمام حواس کے مجموعی مخزن کا نام حسِ مشترک ہے جس کا مستقر ام الدماغ ہے، ایسے ہی کائنات آفاق میں تمام علوم عقل و نقل کے جامع مخزن فرشتہ کا نام جبرئیل ہے گویا یہ کائنات کا اُم الدماغ ہے جن کا کام ہی وحی الٰہی کے ذریعہ ہر قسم کے علوم عقلی و نقلی کا عالموں پر اُتارنا اور علم الٰہی کو غیب کے خزانوں سے شاہد کی طرف منتقل کرنا ہے، پس جب بھی یہ نام لیا جائے گا تو قدرتاً واقف کاروں کا ذہن علوم الٰہی اور وحی ربانی کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ یا جیسے دائرۂ علم و احساس ہیں زبان نطق و کلام کا خزانہ ہے جس کے ذریعہ علوم منتشر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ان آفاقی قوائے علم میں مثلاً روح نامی فرشتہ علمی کلام اور لغات مختلفہ کا خزانہ ہے جس کو ہزاروں زبانوں اور ہزاروں لغات کے ساتھ احادیث نے موصوف بتایا ہے یا جیسے محاسن ذکر میں مخصوص ملائکہ کا سماع ذکر کے لئے آنا، اور ان گنت تعداد میں جمع ہو جانا۔ یا جیسے ذکر اللہ کے بلیغ کلمات کو اُٹھاتے اور بارگاہ قدس تک لیجانے کے لئے مخصوص تعداد میں ملائکہ کا مبادرہ کرنا جیسے بعض صحابہ کا واقعہ پیش آیا۔ یا قرآن سُننے کے لئے بعض صحابہ کی تلاوت کے وقت ملائکہ سکینت کا بصورت قنادیل معلق ہو کر جمع ہونا سب وہی علم و ادراک کی شانیں ہیں۔

کسی موقعہ پر علم لایا گیا ہے اور کسی موقعہ پر لیجایا گیا ہے۔ جیسے:۔ حواس انسانی میں اخذ و ادا دونوں ہی شانیں موجود ہیں۔ ناطقہ علوم دیتی ہے اور سامعہ لیتی ہے۔ پس ملائکہ میں بعض علوم لاتے ہیں جو بمنزلہ زبان و قلم کے ہیں اور بعض لے جاتے ہیں جو بمنزلہ سمع کے ہیں۔ مگر سلسلہ بہرحال علم و احساس ہی کا ہے اس لئے یہ ملائکہ ہی اس عالم کے لئے ادراک و احساس کا خزانہ ثابت ہوتے ہیں۔ جو اس جہان کے آنکھ، کان اور ناک واقع ہوئے ہیں۔ پھر جس طرح سے انفس میں حواس خمسہ کلیتہً قلب کے ایماء و اشارہ کے تابع ہیں کہ اِدھر قلب نے چلنے کی ٹھانی اور اُدھر بلا توقف پیروں نے چال چلنی شروع کر دی۔ اِدھر قلب نے دیکھنے کا ارادہ کیا اور اُدھر فوراً آنکھ کی پلکیں اُٹھ گئیں۔ اور رویت و بینش کا عمل شروع ہو گیا، قلب کی کوئی ادنیٰ نافرمانی ان قوائے احساس کی طرف سے نہیں ہوتی بعینہ اسی طرح عالم آفاق کے یہ قوائے ملائکہ بھی قلب موجودات یعنی عرش الٰہی کے احکام، اور منشاء کے بندے ہیں کہ اِدھر مشیت کا تقاضا ہوا اور اُدھر اُنہوں نے تعمیل کی:۔

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون۔ (القرآن الکریم)

"جس چیز کا انکو حکم دیا جاتا ہے اُس میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا گیا ہو"

بہرحال ان قوائے ادراک (ملائکہ) کے ادراکات مختلف سہی مگر قدر مشترک کے طور پر ان سب کا جوہر کلی علم و ادراک اور عقل و شعور ہے۔ اور اس لئے اگر انہیں حواس دماغی کی طرح اس عالم کے قوائے ادراک و شعور کا لقب دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

پس جس طرح بدنی کائنات میں جہاں بھی احساس و ادراک کا کوئی

پر تو ہے وہ ان ہی حواسِ خمسہ اور دماغی قویٰ کا فیض ہے ایسے ہی اس آفاقی کائنات میں جہاں بھی اور جس نوع میں کسی قسم کے ادراک و شعور کی کوئی کیفیت موجود ہے وہ بلاشبہ اسی نوعِ ملکی کا فیض اور پرتو ہے۔ اس لئے اس کائناتِ عالم میں اعلیٰ ترین وجود ان ہی قوائے باطن کا ہوگا جن کی بدولت اجزاءِ عالم کی نقل و حرکت اور بود و نمود قائم ہوگی۔

پھر کائناتِ انفس ہی کی طرح اس آفاقی جہان میں بھی قوائے ادراک و شعور کے ساتھ کچھ قوائے عمل بھی ہیں، جو ان ہی ملائکہ میں سے ہیں، جو بحکم قوائے علم اجزاءِ عالم کو اُن کے متعلقہ وظائف و اعمال پر اُبھارتے ہیں، خود بھی متحرک ہیں اور اجزاءِ کائنات کو بھی حرکت میں لاتے ہیں۔ گویا جیسے ہمارے اندر قوائے ادراک نظروں سے اوجھل ہیں ایسے ہی کائنات میں یہ قوائے عمل بھی نگاہوں سے مخفی اور پوشیدہ ہیں۔ کوئی کتابتِ اعمال پر مقرر ہے، کوئی رزق اُتارنے پر، کوئی بارش لانے پر ہے کوئی ہوا چلانے پر کوئی سورج کو گھما کر روشنی پہونچانے پر ہے، کوئی بنی آدم کی حفاظت پر کوئی رحمِ مادر پر ہے، کوئی تقدیرات کی نوشت و خواند پر کوئی عرش کے سنبھالنے پر ہے کوئی عالم کی آبادی پر کوئی اُس کی بربادی پر، کوئی موت پر اور کوئی حیات پر وغیرہ وغیرہ۔ جس پر سینکڑوں احادیث شاہد ہیں۔

غرض لاتعداد ہی ملائکہ عملی خدمات پر مقرر ہیں اور لاتعداد ہی بنی آدم سے عملی خدمات لینے اور اُنھیں خدمات پر اُبھارنے پر جیسا کہ ایعاد بالخیر کی حدیث سے واضح ہے یا جیسا کہ رمضان کے منادی کی بابت حدیث میں ہے کہ وہ ہر باغیٔ خیر کو اَقبل اور ہر باغیٔ شر کو اَقصر، کی ندا دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال جیسا کہ انسان کائنات میں اعضاء کی زندگی قوائے باطن کی زندگی سے متعلق ہے ایسے ہی اس جہان میں بھی زمین و آسمان اور بحر و بر اور اُن کی درمیانی مخلوقات کی زندگی ان نفوسِ باطنیہ پر معلق ہے، فرق یہ ہے کہ عالمِ انفس کے بواطن کو قویٰ کہتے ہیں اور عالمِ آفاق کے بواطن کو ملائکہ۔ وہاں کے قویٰ اعراض ہیں، اور یہاں کے اعیان۔ وہاں بھی یہ قوائے باطن کچھ علمی ہیں کچھ عملی یہاں بھی کچھ ملائکہ علمی ہیں کچھ عملی۔ وہاں علمی قویٰ کو حواس اور مشاعرِ ادراک کہتے ہیں۔ یہاں ملائکہ مقربین کہتے ہیں۔ وہاں بھی یہ تمام قویٰ واسطہ اور بلاواسطہ قلبی اشارات کے تابع ہیں یہاں بھی یہ تمام ملائکہ عرشی اشارات کے تابع ہیں۔ یہ حواس بھی کبھی قلب کے اشارات کی نافرمانی اور عصیاں نہیں کرتے وہاں بھی ملائکہ عرشی اشاروں کی کبھی خلاف ورزی اور معصیت نہیں کرتے۔ غرض اس آفاقی کائنات کے لئے انفسی کائنات کی طرح قوائے علم اور قوائے عمل واضح طور پر ثابت ہو جاتے ہیں۔ جن میں اسماء اور نوعیت کا فرق ضرور ہے مگر حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔

پس جیسے کائناتِ انفس میں قوائے عمل خاص خاص نوعیت کے ہیں اور مخصوص ہی اعضاء میں سمائے ہوئے ہیں۔ چال کے قویٰ پیروں میں ہیں اور لین دین کے قویٰ ہاتھوں میں وغیرہ اور وہ بھی اس طرح کہ جو قوۃ جس عضو میں ہے وہ دوسرے میں نہیں یعنی قویٰ بھی مخصوص اور اُن کے مظاہر اور مواضعِ قرار بھی مخصوص ایسے ہی اس آفاقی کائنات میں بھی قوائے عمل کی جیسے انواع مخصوص ہیں ایسے ہی اُن کے مواضع بھی مخصوص ہیں۔ کہ ایک کی قوۃ دوسرے میں نہیں پہونچ سکتی اور نہ اپنا کام دوسرے جزو سے لے سکتی ہے۔ نشو و نما اگر نبات میں ہے تو جماد میں نہیں۔ حس و حرکت اگر حیوان میں ہے تو نبات میں نہیں۔ نطق و فکر اگر انسان میں ہے تو حیوان میں نہیں۔ تجرد اگر فرشتہ میں ہے تو انسان میں نہیں۔ غرض عمل کی قوتیں خود بھی منقسم ہیں اور منقسم ہی اجزاءِ کائنات میں بٹی ہوئی ہیں۔ عالم کا ہر جزو دوسرے جزو سے ممتاز اور الگ ہے۔ گویا ان مختص قوتوں کے ذریعہ عالم کے اجزاء ایک دوسرے سے جُدا تو ہو سکتے ہیں مل نہیں سکتے۔ کیونکہ خصوصیات کے سبب ہر شئی دوسری شئی سے ممتاز اور الگ ہوتی ہے نہ کہ رلتی ملتی ہے۔ کیوں کہ باہمی ملاپ کسی قدرِ مشترک سے ہوتا ہے نہ کہ قدرِ مختص سے۔ پس ظاہر ہے کہ وہ قدرِ مشترک جو سارے عالم کے جزو جزو میں منتشر، مشترک اور بلافصل پوری کائنات میں رُوح کی طرح دوڑی ہوئی ہے وہ صرف احساس و

پانچویں قسط:-

عہد نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

(از مولٰنا بدر الدین علوی، اُستاذ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ)

"مارچ کے مہینے میں اس مضمون کی چوتھی قسط شائع ہوئی تھی جو اُس رسالہ کے ص۱۲ پر ختم ہوتی تھی، کاتب نے غلطی سے اُس قسط کے اخیر میں "بقیہ بر ص فلاں" لکھدیا۔ حالانکہ اُس صفحہ پر یہ قسط پوری ہوگئی تھی، اُس کا کوئی حصہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اِس رسالہ میں مضمون کی آخری قسط درج ہے۔" (ادارہ)

۹- سورۂ براۃ کی آخری آیتوں کا صرف خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملنا خود صحیح بخاری کی اِس روایت کے خلاف ہے کہ:-

عن البراء قال اٰخر سورة نزلت کاملة براءة۔ (بخاری ج۲ ص۶۷۹) "یعنی قرآن کی آخری سورہ جو مکمل نازل ہوئی سورۂ براءۃ ہے"

اور جب یہ سورہ پوری نازل ہوئی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی آخری آیتیں گم ہوگئی ہوں اور محض ایک شخص کے پاس ملی ہوں اور تاریخی شہادت سے بھی ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے حجاج کے مجمع میں پوری سورۂ براءۃ پڑھ کر سُنائی تھی۔ (دیکھئے صحیح بخاری، جلد سوم ص۸۴ و ص۸۵)

اَب اس سلسلہ کی دوسری روایت کو جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب سور میں صحابہ کا ہاتھ تھا، بہ نظر نقد دیکھنا چاہئے۔

یہ روایت ترمذی میں ہے:-

حدثنا محمد ابن بشار نا یحییٰ ابن سعید و محمد ابن جعفر و ابن ابی عدی و سهل ابن یوسف قالوا نا عوف ابن ابی جمیلة نا یزید الفارسی عن ابن عباسؓ قال قلت لعثمان ابن عفان ما حملکم ان عمدتم الی الانفال وهي من المثانی والی براءة وهي من المئین فقرنتم بینهما ولم تکتبوا بینهما سطر بسم الله الرحمٰن الرحیم ووضعتموها فی السبع الطوال ما حملکم علی ذٰلك فقال عثمان ـــــ کانت الانفال من اوائل ما نزلت بالمدینة وکانت براءة من اٰخر القراٰن وکانت قصتها شبیهة بقصتها فظننت انها منها فقبض رسول الله صلی الله علیه وسلم ولم یبین لنا انها منها فمن اجل ذٰلك قرنت بینهما فلم اکتب بینهما سطر بسم الله الرحمٰن الرحیم ووضعتها فی السبع الطوال۔ (ترمذی)

"یعنی حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے سورۂ انفال کو جو مثانی سے ہے، اور سورۂ براءۃ کو جو مئین سے ہے کیوں ملادیا، اور دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی، اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا، حضرت عثمانؓ نے جواب دیا ـــــ کہ سورۂ انفال مدینہ میں پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں ہے اور براءۃ آخر میں نازل ہوئی، اور دونوں کا مضمون ملتا جُلتا ہے، اس لئے میں نے یہ خیال کیا کہ دونوں ایک ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا، اور آپ نے یہ نہیں بتلایا کہ براۃ انفال کا جزو ہے، اِس لئے میں نے دونوں کو ملادیا، اور بسم اللہ نہیں لکھی، اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا۔"

اِس روایت میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ نے دی، مگر انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل صحابہ کا ہے جب ہی حضرت عثمانؓ نے سورۂ انفال اور براۃ کو ملایا اس روایت کی تنقید بھی سند اور روایت دونوں کے اعتبار

سے ضروری ہے، سند کے اعتبار سے اس میں یہ خرابی ہے کہ تمام طرق "عوف ابن ابی جمیلہ" سے چلتے ہیں، عوف کے علاوہ کسی اور راوی نے اس کو روایت نہیں کیا، اور اس کا یہ حال ہے کہ ابن مبارک نے اس کو قدری شیعی کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ہشتم صفحہ ۱۶۷) پھر اسی کتاب میں اسی صفحہ پر میزان الاعتدال کے حوالہ سے اس کو رافضی لکھا ہے۔ ایک اور خرابی اس روایت میں یہ ہے کہ یزید الفارسی مجہول شخص ہے۔ چنانچہ تہذیب التہذیب جلد یازدہم صفحہ ۳۷۱ میں ہے کہ:-

یحییٰ ابن سعید لم یعرفہا۔ "یعنی یحییٰ بن سعید جیسا فنِ رجال کا ماہر شخص اس یزید فارسی کو نہیں جانتا"

درایت کے اعتبار سے حسب ذیل امور اس روایت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ پہلی تو یہی بات ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی بذریعہ تواتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ روایت اس کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے بڑی شد ومد سے وعدہ فرمایا کیا وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک اسی طرح چلتا رہا کہ لوگوں کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ سورۂ انفال اور سورۂ براۃ دو ہیں یا ایک، عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ اتنے زمانہ تک مسلمان اس سے ناواقف رہے ہوں حالانکہ دوسری صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ دونوں جداگانہ سورتیں ہیں، سورۂ براۃ کے تمام وکمال ایک ساتھ نازل ہونے اور مجمع حجاج میں اس کی تلاوت کی روایت صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر مذکور ہو چکی، رہا یہ سوال کہ جب دونوں صورتیں جداگانہ ہیں تو اُن کے بیچ میں دو سورتوں کی طرح بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی، اس کا جواب یہ ہے کہ دو سورتوں کے بیچ میں بسم اللہ کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور بحکم الٰہی ترتیب دینے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کسی تیسرے کو اس میں دخل نہیں ہے، ایسی صورت میں کوئی شخص اس کا سبب نہیں جان سکتا اور یہ معاملہ بھی حروف مقطعات کی طرح رموز قرآنی میں ہے۔

تیسری روایت حضرت حذیفہؓ کی ہے جس سے چند امور خلاف تواتر ظاہر ہوتے ہیں، وہ روایت یہ ہے:-

حدثنا موسى حدثنا ابراهيم حدثنا ابن شهاب ان انس ابن مالك حدثه ان حذيفة ابن اليمان قدم على عثمان وكان يغازي اهل الشام في فتح ارمينية و اذربيجان مع اهل العراق فافزع حذيفة اختلافهم في القراءة وقال حذيفة لعثمان يا امير المؤمنين ادرك هذه الامة قبل ان يختلفوا في الكتاب اختلاف اليهود والنصارى فارسل عثمان الى حفصة ان ارسلي الينا بالصحف ننسخها في المصاحف ثم نردها اليك فارسلت بها حفصة الى عثمان فامر زيد ابن ثابت وعبد الله ابن الزبير وسعيد ابن العاص وعبد الرحمن ابن حارث ابن هشام فنسخوها في المصاحف وقال عثمان لرهط القرشيين الثلاثة اذا اختلفتم انتم وزيد ابن ثابت في شيء من القرآن فاكتبوه بلسان قريش فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتى اذا نسخوا الصحف في المصاحف رد عثمان الصحف الى حفصة وارسل الى كل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواه في كل صحيفة او مصحف ان يحرق قال ابن شهاب اخبرني

"یعنی زہریؒ انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ ابن الیمان جو فتح آرمینیہ اور آذربیجان میں شامل تھے قرآن کی قراۃ میں اختلاف دیکھ کر گھبرا گئے اور واپس ہو کر حضرت عثمانؓ سے کہا، امیر المومنین قبل اس کے کہ کتاب اللہ کے اندر بھی ویسا ہی اختلاف پیدا ہو جائے جیسا کہ یہود ونصاریٰ کے درمیان ہے، اس امت کی خبر لیجئے، اس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے صحیفے منگوائے (یعنی زید بن ثابت کا جمع کیا ہوا قرآن بزمانہ حضرت ابوبکرؓ) اور کہلا بھیجا کہ اسکی نقلیں لے کر واپس کر دیں گے، اور ایک مجلس زید بن ثابت اور تین قریشی صحابہ کی مرتب کر کے نقل کا کام ان لوگوں کے سپرد کر دیا، اور یہ بھی حکم دیا کہ جہاں کہیں انصاری اور قریشیوں کو اختلاف ہو، تو قریش کے محاورے کو ترجیح دیجائے۔ ان حضرات نے نقلیں کرلیں، اور حضرت عثمانؓ نے اصل حضرت حفصہؓ کو واپس کر دیا، اور نقلوں میں سے ایک ایک نسخہ ہر ملک میں بھیج دیا، اور حکم دیا کہ قرآن کے دوسرے نسخے جلا دیئے جائیں۔ ابن شہاب کہتے ہیں، کہ مجھے زید بن ثابت کے بیٹے خارجہ نے بیان کیا کہ اُن کے والد کہتے تھے کہ نقل کرتے وقت سورۂ احزاب کی

خارجة ابن زيد ابن ثابت سمع زيد ابن ثابت قال فقدت آية من الاحزاب حين نسخنا المصحف قد كنت اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقراء بها فالتمسناها فوجدناها مع خزيمة الانصاري من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فالحقناها في سورتها في المصحف

آیت "من المؤمنین رجال" الخ مجھے نہیں ملی، حالانکہ میں یہ آیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا، جب ہمنے اس کو تلاش کیا، تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی، اور ہم نے اُس کو اُس کی صورت میں شامل کر دیا۔"

(بخاری ج ۳ ص ۱۴۰)

اس روایت سے تین باتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک یہ کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قرآن مجید کی قرأۃ میں دور دراز کے ممالک میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس کو دیکھکر حضرت حذیفہؓ سخت پریشان ہو گئے، اور حضرت عثمانؓ کو اس کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی، اور یہ اختلاف اتنا شدید تھا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا جاتا تو قرآن میں بھی یہود و نصاریٰ کی کتب سماویہ کی طرح اختلاف ہو جانے کا اندیشہ تھا

دوسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا تدارک حضرت عثمانؓ نے یہ کیا کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے والے قرآن کی نقلیں کرا کے دور دراز ممالک میں بھیجدیں اور اس نقل میں اختلاف کو اس طرح دفع کیا کہ صرف قریش کے محاورے پر نقل کی بُنیاد رکھی۔

تیسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ والے مصحف میں ایک آیت سورہ احزاب کی درج نہ تھی، جس کا احساس زید بن ثابت کو عہد صدیقی میں نہ ہوا تھا، اور عہد عثمانی میں نقل کے وقت اِس کا احساس ہوا، مجلسِ ناقلین میں سے اس احساس میں وہ منفرد تھے۔ چنانچہ انھوں نے اور اُن کے ساتھ دوسرے ناقلین نے اس آیت کی تلاش شروع کی، اور آخرکار خزیمہ بن ثابتؓ انصاری کے پاس وہ آیت ملی۔ اور اس کو قرآن مجید میں اُس کی جگہ شامل کر دیا گیا۔

اِس روایت پر بھی سنداً اور درایۃً تنقید ضروری ہے، اس کی روایتی حیثیت یہ ہے کہ اس کے راوی بھی ابراہیم اور ابن شہاب زہری ہیں، جن کے متعلق تفصیل کے ساتھ اوپر بحث ہو چکی ہے۔ درایتی تنقید میں ان تمام امور پر نظر ڈالنی ضروری ہے، جو اس روایت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اِن میں پہلی بات قرآن مجید ــــــ میں عظیم الشان اختلاف کا پایا جانا ہے، حالانکہ عہدِ رسالتؐ سے لے کر عہدِ عثمانیؓ اور اس کے بعد کے تمام زمانوں میں قرآن مجید کی جمع و تدوین اور تعلیم و اشاعت میں جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا، اور جس تواتر سے وہ نقل ہوتا چلا آیا تھا، اس کے بعد کسی ایسے بڑے اختلاف کا پایا جانا غیر ممکن ہے، جسے دیکھکر حضرت حذیفہؓ گھبرا جائیں اور جس سے یہود و نصاریٰ کے سے اختلاف کا ان کو اندیشہ ہو۔

دوسرے قرآن تو قریش کے محاورہ کے مطابق نازل ہی ہوا تھا اور اس کے تحفظ، اور اسی شکل میں مسلمانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اور اس کو بغیر کسی تغیر کے قائم رکھنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر تھی، اِس لئے اس کو بدلنے کی جرأت کون کر سکتا تھا۔

تیسری بات یعنی سورہ احزاب کی ایک آیت کا نقل کے وقت پہلے نسخے میں نہ ملنا سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ جمع قرآن والی روایت میں بھی اس کا ذکر ہے کہ چند آیتیں جو کہیں مل نہیں رہی تھیں، بمشکل ملیں وہ سورہ براۃ کی آخری آیتیں تھیں، اور اس روایت میں بتلایا گیا ہے کہ سورہ احزاب کی آیت نقل کے وقت نہیں مل رہی تھی اب قابلِ غور یہ امر ہے کہ پہلے بھی انہیں زید بن ثابتؓ نے جمع و کتابت کا کام کیا تھا، اُس وقت سورہ براۃ کی آخری آیتیں نہیں مل رہی تھیں اور سورہ احزاب والی آیت یا تو اُس وقت گم نہ تھی، یا اُن کو اُس وقت اِس کا احساس نہیں ہوا، اگر گم نہ تھی تو بعد میں کیسے اِس صحیفے سے گم ہو سکتی تھی، جو خود انہیں کا ترتیب دیا ہوا، اور ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا حفاظت کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور پھر حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس آیت کے گم ہونے کا ان کو حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں ترتیب دیتے وقت احساس نہیں ہوا، تو یہ بھی غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابتؓ جیسا حافظ سورہ احزاب کی اس آیت سے پہلی دفعہ غافل ہو، اور پہلی ترتیب کے سالہا سال بعد

تیرھویں قسط:-

تذکرہ اُدبائے دار العلوم دیوبند

(پروفیسر محمد انوار الحسن انور شیرکوٹی اسلامیہ کالج لائل پور)

حضرت نانوتویؒ کی دوسری تحریریں

ابتک حضرت نانوتویؒ کے خطوط سے متعلق تحریروں پر تبصرہ کیا گیا تھا، لیکن دوسرا حصہ مولانا کی اُن اُردو تحریرات کا ہے جو تصنیفات میں پھیلا ہوا ہے، جہاں تک راقم الحروف کی ریسرچ کا تعلق ہے اس میں یہ امر پایۂ ثبوت تک پہونچ چکا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کو اُردو نثر اور نظم پر پُوری قدرت حاصل ہے البتہ تصنیفات کی نثر مکاتیب سے جُدا انداز رکھتی ہے اور اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ چونکہ امام المتکلمین حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب کے علوم وفنون بہت غامض اور عمیق ہیں اس لئے منطق اور فلسفہ کی اصطلاحات نے عبارتوں کے معانی سمجھنے میں دُشواریوں کے باعث تحریروں کو مشکل اور ادق بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں مولٰنا کی طبیعت پر لکھتے لکھتے امنگ آئی ہے وہاں نثر نگاری میں سلاست و فصاحت کے دریا بہا دئے ہیں اور قلم سے آبحیات کے قطرے ٹپکائے ہیں۔ نمونے کے طور پر آبِ حیات کی چند تمہید کی سطریں مولٰنا کی مایۂ ناز تصنیف سے پیش کرتا ہوں، اسمیں مولٰنا آبِ حیات کی کیفیت تصنیف اور سفر حج کے لئے روانگی اور بمبئی پہونچکر تصنیف کی تکمیل اور حضرت مرشد حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں پیشکش کا ذکر فرما رہے ہیں۔ واضح ہو، کہ امام المتکلمین نے آبِ حیات بمبئی کے پنج روزہ قیام میں تحریر فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اوراق مسودہ (آبِ حیات) کا پشتارہ باندھکر جہاز پر چڑھا، اور محض بامداد خداوندی باوجود گمراہی اور ناسپاہی جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو درکنار ہمراہیوں کی گم گشتگی کا بھی اندیشہ تھا دریا پار ہوکر جدہ پہونچا۔ اور وہاں سے بسواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا بیت اللہ زادہا اللہ شرفاً وعزۃ الی یوم القیامہ کا طواف میسر آیا

(بقیہ صفحہ ۱۱ :-)

پھر جب نسخہ اُن کے سامنے لایا جائے تو اُس وقت احساس ہو۔ اِس لئے عقلاً اس روایت کا یہ ٹکڑا محال معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر اِن روایتوں کو جو تواتر کے خلاف ہیں، صحیح تسلیم کرلیا جائے، تو قرآن پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے، اور یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اب بھی اس میں سے کچھ غائب ہو، جو وعدۂ الٰہی انا لہ لحافظون کے بالکل خلاف ہے۔ اِس کے علاوہ اِن روایتوں کا مضمون اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کے خلاف ہے، اِس لئے قرآن کے تواتر کے مقابلہ میں یہ روایتیں ناقابلِ اعتبار ہیں، اور روایت و درایت کی رُو سے بھی غیر معتبر ہیں، ان تین روایتوں کے علاوہ بعض اور روایتیں بھی اختلافِ قرأۃ اور اختلافِ ترتیب کو ظاہر کرتی ہیں، ان سب کا اجمالی جواب یہ ہے کہ وہ اخبار احاد ہیں، جو تواتر کے مقابلہ میں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں، اگر خدا کو منظور ہے تو پھر کسی وقت اِن روایتوں کی بھی تنقید پیش کی جائے گی +

واللہ ھو الموفق للصواب والیہ المرجع والمآب۔

اللّٰھم احفظنا من العقائد الباطلۃ وآراء اھل الاھواء الفاسدۃ۔

اور حضرت پیر و مرشد ادام اللہ فیوضہ کی قدم بوسی سے
رتبۂ عالی پایا۔ اعنی بزیارت مطلع انوار سبحانی،
منبع اسرار صمدانی، مورد افضال ذی الجلال
والاکرام، مخدوم و مطاع خاص و عام، سرحلقۂ مخلصان
سراپا اخلاص، سرلشکر صدیقاں باختصاص، رونق
شریعت، زیب طریقت، ذریعۂ نجات، وسیلۂ
سعادات، دستاویز مغفرت نیازمنداں، بہانۂ
واگذاشت ستمنداں، ہادی گمرہاں، مقتدائے دین
پناہاں، زبدۂ زماں، عمدۂ دوراں، سیدنا و مرشدنا
ومولانا الحاج امداد اللہ لازال کاسمہ امداداً
من اللہ للمسلمین و اہل اللہ کی زیارت سے جو ہنگامۂ
رستخیز مثال، غدر ہندوستان کے بعد وطن قدیم
تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کو چھوڑ کر بحکم اشارات باطنی
بلد اللہ الامین مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً وعزۃً میں
مقیم ہیں، بہرہ اندوز شرف و عزت ہوا۔ بوجہ تہیدستی
دین و دنیا اور کچھ پیش نہ کر سکا اوراق سیاہ مسودۂ
مذکورہ کو پیش کر کے رسم پیش کش بجا لایا۔"

(دیباچۂ آب حیات صـ ۲-۳)

مولانا کی یہ عبارت جس کی چار پہلی سطریں سادہ اور غیر مقفی ہیں
حسب طرز ہیں لیکن جہاں قاسم العلوم کی زبان قلم پر آپ کے پیر طریقت
اور مرشد معرفت کا ذکر آیا تو محبت کی بجلی کوند گئی اور مولانا مقفی
عبارت اور مسجع الفاظ نگینوں کی طرح عبارت میں جڑتے چلے گئے۔

اس عبارت سے مولانا کی مقفی نویسی پر قدرت اور بے تکلف مشکل
الفاظ اور ترکیب جمل کی ندرت کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے اور اس حقیقت
کو باور کرنا پڑتا ہے کہ اگر مولانا فارسی کی مشہور کتاب جو کہ مقامات بدیعی
اور مقامات حریری کے طرز پر لکھی ہوئی ہے یعنی مقامات حمیدی اگر
چاہتے تو چند دنوں میں لکھ کر داد قافیہ نویسی لے سکتے تھے۔ اور اردو کی
مقفی کتاب فسانۂ عجائب کا جواب اسی رنگ میں لکھ سکتے تھے۔

آئیے اب میں آپ کو اسی آب حیات کے دیباچے کی سیر کراتا ہوا
ایک ایسے قطعۂ چمن کی طرف لئے چلتا ہوں جس کے ادبی پھولوں کو
آب حیات کے چھینٹے چھڑک چھڑک کر تازہ و شاداب کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا دیباچہ آب حیات میں آگے چل کر اس مقام پر جہاں پیر و مرشد
نے آب حیات کے مضامین کی داد دی اور تحسین فرمائی ہے لکھتے ہیں:۔

"قاسم ناداں کی تحسین اور تنقیح، ایسی مستحسن اور صحیح۔
ع "زبان گنگ و چنیں نغمۂ خوش آیندہ"
میں کہاں اور یہ مضامین عالیہ کہاں۔ یہ سب اس
شمس العارفین کی نور افشانی ہے۔ یہاں میں بھی مثل زبان
دو دست و قلم، واسطۂ ظہور مضامین مکنونۂ دل عرش
منزل ہوں۔ ورنہ اپنی ہیچمدانی سے، جس پر بے سروسامانی
دوسرے پریشانی دو شاہد عادل گواہ ہوں انکار نہیں
کیا جاتا۔ بے سروسامانی کا حال پوچھئے تو اپنے گھر میں
نہ کوئی عالم جو بوجہ قدر دانی علم کی طرف لگائے نہ اپنے
دل میں شوق جو تحصیل علم میں مزہ آئے۔ اور اس کام سے
دل نہ گھبرائے۔ نہ گھر میں کوئی کتاب جو یہ بات ہو کہ جب
دل چاہا اٹھایا دیکھ لیا، نہ روپیہ پیسے کا حساب کہ
حسب دل خواہ ضروریات تحصیل میں حصہ لیا اور صرف کیا
پریشانی کی کیفیت پوچھئے تو کچھ نہ پوچھئے، ایک
دل ہزار مقصود، پھر ہر مقصود کے لئے ہزار غم موجود
ایک بات ہو تو کچھ بات بھی ہے پھر کس کس کو حاصل
کیجئے جو دل کو قرار آئے اور دل کی پریشانی جائے۔
ساری تمنائیں بر آئیں تو ہم میں اور خدا میں کیا فرق رہ جائے
اور سب آرزوؤں سے دست بردار ہو جیئے اور خدا کے
ہو رہیئے تو ایسی عقل اور ایسی ہمت کہاں سے آئے، کہ
بجز نام خدا اور کچھ نہ بھائے۔ بد نصیب ہو تو پھر کیا بات
ہے، نعمت ولایت ہم سے نابکاروں کو ہاتھ آجائے؟

(دیباچۂ آب حیات)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا عبارت انکی
تحریر کے ایک نئے انداز سے روشناس کرتی ہے، دل پر جذبۂ انکساری

عاجزی، بے سروسامانی، تمناؤں کا ہجوم، پریشانی کی کیفیت، خدا کے ہو رہنے کا شوق مگر عقل و ہمت کی کوتاہی پر منکسر المزاجی، کتابوں کا فقدان دولت سے بے نیازی، ان سب ہی خیالات کے ہجوم میں بظاہر حجۃ الاسلام گھرے نظر آتے ہیں مگر سب مشکلات سے بباطن بے پروا، اور عہدہ برآ معلوم ہوتے ہیں۔ ان تمام کیفیات قلبی کو حضرت قاسم العلوم نے جس مختصر عبارت، فصیح و سلیس الفاظ، دلچسپ اور پرشکوہ جملوں میں ادا کیا ہے وہ بجائے خود نہ صرف قابلِ تحسین بلکہ لائق حیرت ہے کہ ایک عہدِ قدیم کی یادگار، بوریہ نشین درویش، زاہد بے ریا، اور یکتائے روزگار، صوفی و عالم اُس دور میں جبکہ اُردو زیادہ ترقی یافتہ زبان نہ سمجھی جاتی تھی ایسی عبارت آرائی پر پوری دسترس رکھتا ہے۔

انکساری

حضرت مولٰنا نانوتویؒ کے خطوط اور تصنیفات نیز سائلین کے سوالات کے جوابات میں جابجا انکساری، بے سروسامانی اور کتابوں کے پاس نہ ہونے اور اپنی علمی بے مائگی کا ذکر ہے، غالباً کوئی دورِ حاضر کے دلدادہ اس انکساری کو تصنع پر محمول کریں، لیکن یہ حقیقت، حقیقت بنکر دل میں آتی ہے کہ حضرت قاسم العلوم علم کا سمندر ہوتے ہوئے پھر بھی واقعی طور پر اپنے آپ کو علم سے تہیدست خیال فرماتے تھے اور یہ بھی صحیح بات ہے کہ العلم حجاب الاکبر کے مطابق واقعیت تھی کہ علوم کے سمندر سینے میں بہتے ہوں اور اس کے باوجود علم سے خالی دامن اپنے آپ کو تصور کرتے ہوں۔ یہ عجب بات تھی کہ حضرت مولٰنا کی بعینہ مثال اس چشمہ کی تھی کہ جس سے پانی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہو، اور جتنا پانی نکل رہا ہو اتنا ہی اندر سے جوش کے ساتھ اُبل کر آتا ہو۔ یہی حال مولٰنا کے علوم کا تھا۔ اُن کا سینہ کتابوں کی لائبریری اور ان کا دل علوم کا بحرِ بیکراں اور اُن کا دماغ خلاق مضامین و معانی تھا۔ پوچھنے کی دیر ہوتی تھی کہ معقولات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے منقولات کے جوابات سامنے دست بستہ حاضر تھے۔ مولٰنا کو اپنے قلم پر اختیار نہ ہونے کا خود اعتراف ہے۔

غرض کہ مولٰنا کا علم وہبی تھا اِس پر انکساری کا یہ عالم۔ جس زمانہ میں حضرت مولٰنا اپنے اُستاد حدیث مولٰنا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مطبع میں ملازم تھے تو حضرت شیخ بخاری شریف کا حاشیہ تحریر فرما رہے تھے، کثرت مشاغل کے باعث چھ آخری پاروں کی شرح یا حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو لکھنے کے لئے ارشاد فرمایا جیسا کہ سوانح قاسمی میں حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمۃ نے ذکر فرمایا ہے۔ اس وقت حضرت بانی دار العلوم دیوبند کی عمر تیئس ۲۳ سال کی ہوگی کیوں کہ اُنیس سال کی عُمر میں تحصیل علوم سے فراغت کے فوراً بعد حضرت مطبع سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لوگوں نے مولٰنا محدث سہارنپوری سے کہا کہ آپ نے ایک نو آموز آدمی کو بخاری شریف کے حاشیہ کا کام سُپرد فرما دیا ہے۔ لیکن حضرت مولٰنا احمد علی صاحب نے لوگوں سے فرمایا کہ "میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بغیر سوچے سمجھے ایسا عظیم الشان کام کسی نااہل کے سپرد کر دیتا" چنانچہ حضرت سہارنپوری نے مولٰنا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا حاشیہ بلکہ شرح لوگوں کو دکھائی اور بہت مسرت کا اظہار فرمایا۔

اِس امر سے آپ کو واضح ہو جائے گا کہ حضرت قاسم العلوم کی علمی نعمتوں کا مقام کیا تھا کہ کم عمری میں بخاری کے آخری ان پاروں کی شرح بالکل اپنے شیخ کے انداز میں تحریر فرمائی جس میں اہم مسائل ہیں اور جن میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر مذہب حنفیہ پر طنز کیا ہے۔ لیکن اللہ رے مولٰنا محمد قاسم صاحب رح کی انکساری کہ اپنی علمی کم مائگی کا ہر جگہ اظہار ہے۔

ایک خواب

گذشتہ دو سال سے راقم الحروف اپنے حضرات کی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف تھا، اور بالخصوص حضرت قاسم العلوم والخیرات کی کتابوں اور تصنیفات کو بامعان نظر پڑھ رہا تھا کہ سوانح قاسمی میں حضرت حجۃ الاسلام کے حواشی بخاری کا ذکر پڑھا، دل میں اُن حواشی کی جستجو اور شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ احتیاط کے ساتھ مقدمہ بخاری از مولٰنا احمد علی صاحب پڑھا۔ خاتمہ پر بھی گہری نظر ڈالی سب کچھ ملا، لیکن حضرت حجۃ الاسلام کا نام نہ ملنا تھا نہ ملا۔ پھر چوبیسویں پارے سے تیسویں پارے تک ہر ایک پارے کی ابتداء اور انتہا پر نظر ڈالی اور رات کے گیارہ بجے تک

بخاری شریف کی ورق گردانی کرتا رہا اور بالآخر اسی فکر میں سوگیا
یہ ۲۴ر۲۵ جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب تھی۔ رات کو خواب
میں دیکھتا ہوں کہ ایک بستی میں حضرت مولانا نانوتوی علیہ الرحمۃ
تشریف لائے ہیں۔ مجھے کسی نے اطلاع دی اور میں انتہائی
مسرت میں دوڑا ہوا اُس مقام پر پہنچا جہاں حضرت مولانا
محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ فروکش تھے۔ برابر میں حضرت
قطب الارشاد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہیں۔ میں نے جاتے
ہی دونوں حضرات سے مصافحہ کیا اور حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ
کی دست بوسی کی۔ حضرت ایک کالی کملی اوڑھے ہوئے تھے اور
سر پر ٹوپی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا بخاری شریف کے
آخری چھ پاروں کا حاشیہ جناب نے تحریر فرمایا ہے؟ ارشاد فرمایا۔
کہ بھائی کیا ہے۔ یعنی مناسب الفاظ میں ٹالنے والے الفاظ ارشاد
فرمائے جب میرا مدعا پورا ہوتا نظر نہ آیا تو میں نے عرض کیا حضرت
یہ بات تو بتائے ہی بنے گی۔ اس پر مولانا نے صاف الفاظ میں
ارشاد فرمایا کہ ہاں! میں نے ہی لکھے ہیں۔ صبح کو جب آنکھ کھلی
تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ چنانچہ میں نے یہ خواب اپنی
یادداشت میں نوٹ کرلیا۔

اب جبکہ خواب کا ذکر آگیا تو دوسرا خواب بھی ذکر کردوں۔
۱۰ر۱۱ فروری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب میں نے حضرت مولانا
کو دوسری مرتبہ خواب میں دیکھا۔ آپ ایک لکڑی کے تابوت
میں تشریف فرما ہیں اور اُس کے نیچے پانی کی ایک نہر بہ رہی ہے
حضرت اس میں اٹھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ میں قریب پہنچا اور بالکل
سر کے نزدیک داہنے بازو کے پاس ہوں۔ اتنے میں اس صندوق
سے نکل کر حضرت ایک مکان کے کمرے میں فروکش ہوگئے۔ اس
مکان کے دو کمرے تھے۔ جس کمرے میں حضرت قاسم العلوم
فروکش ہوئے اس میں استاذی مولانا محمد طیب صاحب
بھی ہیں اور میں بھی، تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں دوسرے کمرے
میں گیا تو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو
وہاں آرام کرتے پایا۔ آپ نے مجھے بیٹھنے کے لئے فرمایا۔ چنانچہ میں
حضرت کی خدمت میں بیٹھ گیا۔ خواب اسی حالت میں ختم ہوگیا۔

تو بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔ میں نے حضرت حجۃ الاسلام
کی آب حیات کے دیباچہ کی عبارت پیش کی تھی اور اس میں آں
مخدوم نے اپنے ذاتی حالات جس انداز میں پیش کئے اسی میں اپنی
بے سروسامانی اور کتابوں کے پاس نہونے کا ذکر تھا۔ لیکن میں یہ
حقیقت پیش کر رہا تھا کہ حضرت باوجود اس کے کہ علوم کے بحر بیکراں
تھے، انتہا درجے کے منکسر المزاج واقع ہوئے تھے ؎

الناس محتاج اهل العلم قاطبة
واكثر الناس يستغني عن الدول
كم من غني جميع الناس يجهله
وعالم صيته في السهل والجبل

"تمام انسان عالموں کے محتاج ہیں، حالانکہ اکثر لوگ دولتوں سے بے نیاز ہیں اور ان کو دولت والوں کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ کتنے ایک مالدار ہیں کہ انہیں کوئی جانتا بھی نہیں، اور کتنے عالم ہیں کہ پہاڑوں اور میدانوں میں انکی شہرت پھیل چکی ہے۔"

میں اپنے مرکز سے دُور جا رہا ہوں حالانکہ مجھے حضرت مولانا
کی تحریروں کے چند اور ٹکڑے پیش کرنے تھے۔

حسب ذیل عبارت 'تقریر دلپذیر' کی لکھتا ہوں جو حضرت مولانا
کی مشہور اور مایۂ ناز تصنیف ہے اور علم الکلام کا بصیرت افروز
سرمایہ ہے۔ اس تصنیف کو محتاط اور غائر نظر سے پڑھنے پر
معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے اندر قدرت نے ایک موجودہ دور
کے لئے علم کلام کی اجتہادی قوت عطا فرمائی تھی۔ اور حقیقت بھی
یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا کے امام المتکلمین ہونے میں
شک نہیں رہتا۔ مولانا عقل کی حقیقت اور اس کے مراتب
بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایسے ہی ہماری تمہاری عقل سے بھلائی اور برائی کی
کمی بیشی وہیں معلوم ہوتی ہے جہاں بہت فرق ہو تھوڑے
تھوڑے فرق اور ان کی مقدار اس سے ہرگز دریافت

نہیں ہو سکتی۔ یہ بات بجز علم خداوندی کے اور کسی کا کام نہیں عقل بھی اسی درگاہ کی دریوزہ گر ہے۔ کیوں کہ عقل کی حقیقت بعد غور کے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دفتر علم الٰہی کا ایک محافظ دفتر ہے کیوں کہ کوئی بات ایسی نہیں کہ جس میں عقل سے مشورہ نہ کرلیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پاس ہر بات کی کچھ نہ کچھ خبر ہے بلکہ سب خبر ہے۔ بہر حال بعد غور کے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دفتر علم الٰہی کا ایک محافظ دفتر ہے بلکہ اس دفتر کے حروف اور نقوش دریافت کرنے کے لئے نظر ہے۔ جیسے دفتر مبصرات یعنی دیکھنے کی چیزوں کے لئے چشم ظاہری عنایت ہوئی ہے ایسے ہی اس دفتر پنہانی کی سیر کے لئے عقل جو ایک چشم پنہانی ہے، مرحمت ہوئی ہے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جس آنکھ سے چھوٹی بڑی سب چیز کو مبصرات میں سے دیکھ سکتے ہیں ایسے ہی عقل سے بھی اس دفتر کے تمام حروف، اور نقوش کو دریافت کرسکتے ہیں یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں عقل سے مشورہ نہ کرسکیں۔ اور جیسے سیاہ وسفید کا فرق مثلاً آنکھ سے معلوم ہوسکتا ہے ایسے ہی نیک و بد کا فرق دیدۂ عقل سے معلوم ہوسکتا ہے لیکن جیسے آنکھوں میں بھی فرق ہے، سب سے یکساں فرق معلوم نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات الٹا معلوم ہونے لگتا ہے۔ احول یعنی بھینگے کو ایک کے دو معلوم ہوتے ہیں اور یرقان والے کو سفید چیز بھی زرد نظر آتی ہے ایسے ہی ہر عقل سے نیک و بد کا فرق صحیح نہیں معلوم ہوسکتا اور جیسے کم نظروں کو بعضے رنگ مثلاً مکوئی، عنابی، سیاہ سب ایک ہی نظر آتے ہیں، ایسے ہی کم عقلوں کو بہت سے امور نیک و بد سب یکساں معلوم ہوتے ہیں۔" (تقریر دلپذیر مطبع قاسمی صہ ۴۷ و صہ ۴۸)

اس عبارت میں رئیس المتکلمین نے عقل کی تعریف اور اس کے درجات کا ذکر فرمایا ہے۔ نثر میں گو کہ علمی مسئلہ مذکور ہے مگر عبارت میں سادگی موجود ہے۔ لیکن چستی مفقود ہے۔ جملوں کی باہم جکڑ بندی اور گرفت میں ڈھیلا پن ہے۔ خطوط کی نثروں کی سی باہمی ترتیب و تسلسل یہاں نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ بظاہر اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتی کہ حجۃ الاسلام مضامین کی آمد اور ہجوم معانی میں ایسے گھر جاتے تھے کہ الفاظ کی طرف سے توجہ قطعاً ہٹ جاتی تھی۔ ان کی تصانیف اور خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوالات کے جوابات اور تحقیقات کے لئے حجۃ الاسلام کے پاس ہر چیز نقد تھی۔ اُن کو تصنیفات کے لئے کتابوں کے کھنگالنے اور تحقیقات کی ضرورت نہ تھی ہر چیز کا دفتر سینے میں بند تھا۔ اسی مضامین کی آمد اور اژدہام کے متعلق سالک و مجذوب حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب قاسم العلوم کی سوانح میں لکھتے ہیں:۔

"آمد معانی اور مضامین کی (مولٰنا محمد قاسم صاحب کو) ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضی بار حیران ہوجاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں۔" (سوانح قاسمی صہ ۱۶)

حضرت شیخ الہند مولٰنا محمود الحسن صاحب "حجۃ الاسلام" مصنفہ حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب کے متعلق دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"سیدی و مولائی حضرت مولٰنا مولوی محمد قاسم صاحب متعنا اللہ تعالیٰ بعلومہ و معارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلہ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ یعنی ۷ مئی سر پر آگئی۔ چوں کہ وقت بہت تنگ تھا اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ غالباً ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔ جلسۂ مذکورہ میں تو مضامین مندرجہ تحریر مذکورہ کو زبانی ہی بیان فرمایا۔"

(حجۃ الاسلام قاسمی صہ ۲)

اس تحریر سے بھی معلوم ہوا کہ "حجۃ الاسلام" حضرت مولٰنا نے ایک دن اور رات کے بعض حصہ میں نہایت عجلت میں تحریر

فرمائی تھی۔ اس لئے مولٰنا عبارت کا زیادہ اہتمام نہ فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تصنیفات کی اُردو زبان مکتوبات کی زبان سے مختلف نظر آتی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکاتیب کی زبان میں تصانیف کی زبان سے تفاوت اور فرق بھی ہوتا ہے چنانچہ غالب کے خطوط اور اس کی دوسری انشاءنگاری میں یقیناً فرق ہے بلکہ قریب قریب یہ حال تمام مصنفین کی تصانیف اور ان کے مکتوبات میں صاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ شبلی، اکبر الٰہ آبادی، امیر مینائی، غالب، عبد الماجد دریابادی، سر سید کے خطوط، اور تصانیف میں آپ یہ فرق واضح طور پر پائیں گے۔

حضرت مولٰنا کی ایک اُردو عبارت اور ملاحظہ فرمائیے جس میں اُمتیوں کے سلام کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچنے اور آپ کا سلام دینے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"حاصل معنی حدیث شریف کے یہ ہوں گے کہ جب کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتا ہے تو خداوند کریم آپ کی روح پر فتوح کو اس حالت استغراق فی ذات اللہ تعالیٰ وتجلیات اللہ سے جو بوجہ محبوبیت و محبیت تامہ آپ کو حاصل رہتی ہے متوجہ فرما دیتا ہے یعنی مبدأ انکشاف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انبساط الی اللہ حاصل تھا مبدل بانقباض ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے ارتداد علی النفس حاصل ہوتا ہے۔ اور اپنی ذات اور صفات اور کیفیات اور واقعات متعلقہ ذات وصفات سے اطلاع حاصل ہو جاتی ہے۔ سو چونکہ سلام اُمتیاں بھی منجملہ وقائع متعلقہ ذات خود ہیں اس لئے اس سے مطلع ہو کر بوجہ حسن اخلاق ذاتی جواب سے مشرف فرماتے ہیں۔ اس صورت میں اثبات حیات اور دفع مظنۂ ممات یعنی انقطاع تعلق حیات کے لئے جواب ہیں اور تکلفات کی حاجت نہ رہے گی۔ قطع نظر تصدیق وجدانی کے جو واقفان حقیقت مبدأ انکشاف کو حاصل ہے لفظ رد جو خود حدیث میں موجود ہے اس پر شاہد ہے۔" (آب حیات)

یہ عبارت سراپا اصطلاحات سے لبریز ہے۔ تصوف اور منطق کے متعین الفاظ، مضامین کی وسعت اور الفاظ کی قلت نے عبارت کو مغلق بنا دیا ہے درانحالیکہ مضمون کے پرے کے پرے مولٰنا کے سامنے سربسجود ہیں۔ اور ان کو باندھنے کے لئے، اس کیفیت قلبی کے ساتھ جو حضرت قاسم العلوم پر طاری ہے اور وہ والہانہ انداز، جو رگ رگ میں نشۂ معرفت کا سمایا ہوا ہے، جو الفاظ سامنے آئے انہیں میں مضمون کو سمو دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابو داؤد شریف کی اس حدیث یعنی ما من مسلم یسلم علیّ الا ردّ اللہ علیّ روحی حتی اسلم علیہ او کما قال (جو مسلمان بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح واپس کر دیتے ہیں تاآنکہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں) کی توجیہ جس نور بصیرت سے حضرت رئیس الاصفیا نے فرمائی ہے وہ خاکم بدہن امام رازیؒ کو بھی نہ سوجھی ہوگی۔ حضرت قاسم العلوم کے دل پر یہ مضامین کا توارد آپ کی ریاضت جلائے قلب، صفائے روح اور انکسار نفس کا نتیجہ ہے۔ یہاں وہ روح نہیں جو بوعلی سینا یا ابن مسکویہ کے اندر کام کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ استدلالی اور منطقیانہ جواب میں وہ سکون نہیں ملتا جو آئینۂ قلب پر تجلیات سے نکلے ہوئے انوار کی شعاعوں میں ملتا ہے۔ بقول مولٰنا رومؒ ؎

فہم خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ
ہر کجا پستی است آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

بہر حال حضرت مولٰناؒ نے جس عالمانہ انداز اور مختصر عبارت میں اس حدیث مذکور کی توجیہ فرمائی وہ یہ ہے کہ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا مقام عشق اور مقام محبوبیت فنا و استغراق اس درجہ پر ہے کہ روح محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو سوائے محویت احدیت کے اور سب باتوں سے بے خودی ہوتی ہے اور کسی چیز کا ہوش

نہیں ہوتا اسی کیفیت کو صوفیا کے یہاں انبساط کہا جاتا ہے اور جب امتی سلام پیش کرتے ہیں تو ازرہ رحمۃ و کرم، اللہ تعالیٰ آپ کو ہوش میں لاکر سلام دلانے کی کیفیت اور ہوش دیدیتے ہیں اور اسی کیفیت کو صوفیا کے یہاں قبض یا انقباض کہا جاتا ہے۔

یہ غیبی مضامین دراصل حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے اس استغراق کا نتیجہ ہیں جس میں وہ اکثر بے ہوش رہتے تھے اس مذکورہ عبارت کے لئے لفظوں کی قطع و برید، اردو زبان کی تہذیب اور جملوں کی ترکیب کا مولنا کو ہوش کہاں رہتا تھا۔ اور یہی وہ مضامین عالیہ اور نوادر ہیں جن کو دیکھکر اور پڑھ کر حضرت مولنا اشرف علی صاحب کے ملفوظات حصہ چہارم ملفوظ ۱۷۱ ص ۱۵۰ پر یہ حقیقت الفاظ کا جامہ پہنکر بروئے کار آئی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب رازی اور غزالی نہیں پیدا ہوتے۔ میں نے کہا کہ تمہارا خیال غلط ہے بفضلہ تعالےٰ اُن سے بڑھکر اس وقت موجود ہیں۔ اُن حضرات کی تحقیقات دیکھ لی جائیں اور اُس وقت کے بعض محققین کی بھی تحقیقات دیکھ لی جائیں معلوم ہو جائے گا کہ اب بھی رازی اور غزالی بلکہ اُن سے اکمل موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ زمانہ غلبۂ خیر کا تھا اب غلبۂ شر کا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ اس وقت علوم اور کمالات کا خاتمہ ہو چکا ہے سو بفضلہ تعالےٰ رازی اور غزالی اب بھی موجود ہیں" (ملفوظ ۱۷۱ ص ۱۵۰)

بہرحال یہی وہ رنگ قاسمی تھا جس کی تعبیر علامہ عثمانی نے اپنے قلم و زبان سے کی اور جن کو قاسم ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہی اُس خواب کی تعبیر ہے جو اوپر گذرا کہ ایک کمرے میں حضرت مولنا نانوتویؒ اور دوسرے میں حضرت عثمانیؒ تھے۔

بہرحال مضامین عالیہ بیان کرتے وقت مولنا محمد قاسم صاحبؒ کی اُردو زبان میں علمی اصطلاحات، کلامی مسائل صوفیا کے علوم کے باعث اشکال اور عبارت میں اغلاق پیدا ہوا۔ درانحالیکہ حضرت کی اکثر تصانیف بہت عجلت میں لکھی گئی ہیں۔ ورنہ مولنا سلیس، شگفتہ اور مسلسل اُردو لکھنے پر بخوبی قادر تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ مکتوبات کے رنگ میں اپنے دیگر معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔

(باقی آئندہ)

دوسری قسط:۔

ادب کی شرعی حیثیت

(حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ)

یہ آداب کسی ایک آدھ شرعی حکم کے لئے نہیں بلکہ پوری شریعت کی حد بندی ان ہی آداب سے کی گئی ہے۔ اگر ان آداب کی حدود کو توڑ دیا جائے تو نظام شریعت کی بنیادیں استوار نہیں رہ سکتیں۔ کیوں کہ افعال شرعیہ میں ایک حصہ مامورات کا ہے، جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ایک حصہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا حکم کیا گیا ہے۔ ان مامورات پر جماؤ اور منہیات سے بچاؤ کیلئے کچھ احتیاطی حدود رکھی گئی ہیں جن کے دائرہ میں محدود ہوجانے ہی سے اصل مامور و منہی محفوظ رہتے ہیں اور ان ہی احتیاطی حدود کا نام "آداب شرعیہ" ہے اِس لئے یہی آداب درحقیقت امر و نہی کے شرعی نظام کو باقی اور محفوظ رکھنے کے کفیل اور ضمانت دار ہیں جبتک ان آداب پر جماؤ اور استقرار رہے گا اصل احکام پر آنچ نہ آئے گی اور جونہی ان آداب کے کنارے ٹوٹ جائیں گے وونہی اصل مقاصد احکام کا قلعہ مسمار ہوجائے گا۔

البتہ یہ حدودِ آداب کچھ تو منصوص ہیں جو تعبیرات شرعیہ کی عبارۃ ہی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور کچھ ذوقی ہیں جو وجدان صحیح سے سامنے آتی ہیں لیکن ذوقی بمعنی اختراعی نہیں بلکہ بواسطۂ ذوق ہو۔ ان ہی نصوص کتاب و سنت کی دلالت و اشارات یا اقتضاء سے مفہوم ہوتی ہیں، البتہ اُن کے فہم کے لئے مطلق ذوق کافی نہیں بلکہ ذوقِ سلیم اور وجدان صحیح کی ضرورت ہے جو ایک طرف تو فطرۃً سلامتی و صحت لئے ہوئے ہو اور دوسری طرف شرعی اتباع پیروئ سنت اور محبت نبوی و عشقِ خداوندی نے اُسے مانجھ کر اور زیادہ صاف کردیا ہو جس کے صیقل شدہ آئینہ میں یہ دقیق آداب منعکس ہونے لگیں۔ پس یہ دقیق آداب بھی شرعی ہی ہوتے ہیں مگر شریعت میں سے اُن کا نکال لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا بلکہ صرف اُن ہی مصفا قلوب کا جو فطرۃً تشریعی ذوق سے مناسبت و قرب رکھتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً نادانوں اور کم فہموں یا عوام اہل علم کو یہ آداب ان راسخین فی العلم کے اتباع کے بغیر نصیب نہیں ہوتے۔ پس ان آداب اور اُن کی حدود کو ایک راسخ فی العلم اپنے ذوق اجتہاد سے اور ایک عامی اپنے ذوق انقیاد سے پاتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعہ اپنے دینی نظم کی حفاظت کرتا ہے۔

مثلاً منہیات شریعت میں اگر زنا حرام قرار دیا گیا ہے تو شریعت نے محض فعل زنا ہی سے روک دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسباب و دواعئ زنا سے بھی رُک جانے کا حکم دیا ہے۔ جو فی نفسہ چاہے ممنوع نہوں مگر اسباب زنا ہونے کے سبب وہ بھی زنا کے حکم میں آکر ممنوع ٹھہر گئے۔ جیسے نامحرم عورت پر نگاہ ڈالنا، اُس کی آواز پر کان دھرنا۔ اُس کی خوشبو پر ناک رکھنا، اُس کی طرف چل کر جانا، اُس کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھانا وغیرہ کہ یہ احتیاطی حدود ترک زنا کے آداب کہلائیں گی۔ اور اگر فعل زنا کبیرہ گناہ کہلائے گا تو زنا کے یہ اسباب و دواعی صغیرہ گناہ کہلائیں گے کہ اُن میں گناہ ہونے کی شان زنا ہی کی نسبت سے آتی ہے ورنہ فی نفسہ یہ افعال ممنوع نہیں تھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احتیاطی حدود پر سختی سے عمل کرتے رہنے سے نہ صرف یہی کہ آدمی زنا سے بچا رہے گا بلکہ اُس کے قلب میں ایک ایسا احتیاطی ذوق پیدا ہوجائے گا جو اُس شخص کو نامحرم عورت کے تصور سے بھی بچائے جلائے گا اور آدمی سمجھ لے گا کہ میرے لئے اس نامحرم کے جمال کی طرف فکر دوڑانا بھی جائز نہیں، بلکہ مجھے ان ظاہری حدود کا پابند ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس ظاہر کے

اثر سے متاثر ہو کر میرا باطن بھی زنا سے پاک رہے۔ اور جبکہ باطن کا عمل فکر و تصور ہے تو باطن کا زنا درحقیقت اجنبیہ کا دھیان اور خیال زنا ہے جو میرے لئے یقیناً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے صراحتاً اُسے زنا کے تصور و دھیان سے رُکنے کا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا اور جبکہ احکام شرعیہ ظاہر پر لگائے جاتے ہیں تو احوالِ قلب پر ظاہری حکم لگائے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ مگر ذوقِ احتیاط اور ظاہری حدود کی مسلسل پابندی کا یہ قدرتی ثمرہ ہے کہ ظاہر سے زیادہ آدمی باطن سے عمل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے جبکہ ظواہر اعمال کی مشق و تکرار سے اُس کے باطن میں عمل کا ملکہ اور مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور وہ اُسے گناہ ہی سے نہیں خیال گناہ سے بھی باز رکھنے لگتا ہے۔ اندریں صورت باطن کے اس ذہنی عمل کو کہ آدمی زنا کے تخیل سے بھی باز آجائے عمل یا شریعت یا شرعی حدود سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا، بلکہ اُسی سلسلۂ عمل کا ایک باطنی کنارہ تصور کیا جائیگا اور جبکہ اس باطنی جڑ ہی سے ظاہر کی یہ ساری تعمیر اُٹھتی ہے تو اُسے اس شرعی ممنوع کی اساس و بنیاد کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ممنوع کہا جانا ضروری ہوگا۔ پس آدابِ شرعیہ کہیں باہر سے لاکر شریعت کے سر نہیں تھوپے جاتے بلکہ شریعت ہی کے اندر سے نکال کر شرعی نظام میں اپنے موقعہ پر چسپاں کر دیے جاتے ہیں۔

اِسی طرح مثلاً شراب بلاشبہ حرام ہے لیکن اُس سے بچانے کے لئے وہ برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار دے دیے گئے جو شراب خواری کے لئے مخصوص ہوں اور جن کے استعمال سے خواہ مخواہ ہی شراب کا دھیان آئے۔ تاکہ اُن کے سامنے نہ رہنے سے شراب کا دھیان ہی نہ آنے پائے۔ پس ان ذرائع کے استعمال کو قطع کر کے شریعت نے اصل مقصد (ترکِ شراب) کو محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن ذرائع سے بچتے رہنے کا خوگر انسان شراب خواری ہی سے نہیں بچے گا بلکہ اُس کے تخیل پر بھی لاحول پڑھے گا۔ حالانکہ بظاہر یہ تخیل ممنوع یا گناہ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب وہ اصل ممنوع، اور معصیتہ کبیرہ تک پہونچا دینے کا طبعی راستہ اور ذریعہ ہے اِس لئے اس ذوقی حکم (ترکِ تخیل) کو بھی راہ شریعت سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ انتظامِ شریعت کی لائنوں پر اُسے احتیاطی حکم کہا جائے گا جس کے لئے اگر فتویٰ کا لفظ استعمال نہیں کر سکیں گے تو تقویٰ کا کلمہ استعمال کریں گے۔ سطح پرست نگاہوں میں تقوے کی یہ حدود خواہ وہم پرستی دکھائی دیں یا تنگ خیالی نظر آئیں لیکن دُوربین نگاہوں میں یہ احتیاطی حدود تحفظ دین کا ایک طبعی، اور سائنٹیفک نظام ہی نظر آئیں گی جو محارمِ شریعت کی شاہی چراگاہ کے لئے ڈول بندی کا حکم رکھتی ہیں۔ تاکہ غیر محتاط چرواہے اِن ڈولبندیوں سے بھی باہر ہی باہر رہیں اور اصل چراگاہ تک پہونچنے پائیں۔ پس عقلاً ایک مبصر کے نزدیک کسی ممنوع مقصد سے رُکنے کا طریقہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ اس کے تمام وسائل اور بعید سے بعید ذرائع سے بھی روک دیا جائے۔ ورنہ اصل مقصد سے بچائے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اِس لئے یہ دقیق حدود عمل بھی جو بظاہر کتاب و سنت کے الفاظ میں صراحتہً نظر نہ آئیں معانیٔ کتاب و سنت کا جزو بنکر ماموُرات و منہیات ہی کا جُزو کہلائیں گی۔

فقہا و مجتہدین رحمہم اللہ نے ان ہی مخفی حدود کو اپنے نورِ اجتہاد سے کھولا ہے جس پر وہ مخترع کہلائے حالانکہ اُن سے زیادہ متبع دوسرا نہیں کہ ظاہری حدود کے ساتھ باطنی حدود تک کو بھی شریعت ہی کے اندر سے نکال کر اُن کا اتباع کیا اور کرایا۔ مثلاً اسی زنا و شراب کے جزیہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرتے وقت کسی اجنبی عورت کا دھیان باندھ لے تو یہ فعل مباشرت اُس کے حق میں ناجائز ہو جائے گا کیوں کہ اُس نے اگرچہ عمل سے زنا نہیں کیا لیکن تخیل سے زنا کر لیا۔ پس اگر نصوص کتاب و سنت میں لفظوں میں اِس خیالی زنا کی ممانعت وارد نہ بھی ہو تب بھی اِس حکم کو فقہاء کا اختراع نہیں کہا جائے گا بلکہ ممانعتِ زنا کی اُن ہی مخفی حدود کے سلسلہ کی ایک ناگزیر کڑی کہا جائے گا جو آداب کے عمل پیہم سے ذوقِ ادب اور ذوقِ تقویٰ کا ایک طبعی نتیجہ ہے جسے فقہاء نے بصورت حکم ظاہر کر دیا ہے۔ گویا یہ اُسی ممانعتِ زنا کا ایک انتہائی اور مخفی کنارہ ہے جو احکام کے طویل اور مرتب سلسلہ کے ساتھ درجہ بدرجہ جڑا ہوا ہے جسے عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں مگر مبصر نگاہوں نے اُسے پا لیا۔

یا جیسے فقہاء ہی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی شخص رنگین شربت پیتے ہوئے (جو بلا شبہ حلال ہے) شراب پینے کا دھیان باندھ لے کہ گویا وہ شراب کا جام چڑھا رہا ہے تو شربت نوشی اُس کے حق میں خیالی شراب نوشی ہونے کے سبب ناجائز ہو جائے گی۔ کیونکہ اُس نے فعلاً گو شراب نہیں پی مگر خیالاً ضرور پی لی۔ اور اگر اُس پر قضاءً ظاہر شریعت کی رُو سے شراب خواری کا حکم نہیں لگایا جائے گا تو دیانۃً شارع حقیقی (رب العزت) کی طرف سے اُس کے باطن کو ضرور شراب خوار کہا جائے گا۔ ہاں پھر جیسے افعال زنا و شراب پر حدّ شرعی اور تعزیرات جاری ہوں گی ایسے ہی ان باطنی حدود کی خلاف ورزی پر بھی آدمی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا۔ قضاءً نہ سہی تو دیانۃً ہی سہی۔ اگر آفاقی سزائیں نہ دیجائیں گی تو انفسی ہی سہی یعنی فعل زنا و شراب پر اگر سنگساری اور دُرّہ زنی کی حدّ جاری ہوتی تو اس ذہنی زناکاری اور شراب خواری پر انفسی بیماریاں، آفات غم والم، تشویش و پراگندگی، فتنے اور پریشانیاں باطن پر ہجوم کر آئیں گی۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر سزا یہ کہ قلب کی نورانیت زائل ہو کر اس میں ظلمت و کدورت کے بادل اُمنڈ آئیں گے جو اس کے سکون کو زائل کر کے قلب کی بڑی سے بڑی بیماری کا دروازہ کھول دیں گے۔ ع

"نیست بیماری چو بیماریٔ دل"

پس یہ تشریعی رنگ کی سزائیں نہوں گی تو تکوینی رنگ کی ہونگی۔ ظاہری آلات سے نہ دی جائیں گی تو باطنی وسائل سے دیجائینگی۔ کیونکہ یہ جرائم ہی باطن اور باطنی آلات (فکر و خیال) سے عمل میں آئے تھے۔ وہ کھلی سزائیں بھی من اللہ تھیں اور یہ مخفی سزائیں بھی جن کا تعزیر ہونا مخفی ہے من اللہ ہی ہیں۔ بہرحال ظاہر و باطن میں سے جس سے بھی شراب خواری و زناکاری کا صدور ہوگا اور اُن میں سے کسی پر بھی آدمی مواخذہ خداوندی سے بری نہیں رہ سکتا۔

وان تبدوا ما فی انفسکم اوتخفوہ یحاسبکم بہ اللہ فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء واللہ علیٰ کل شیٔ قدیر

"اور جو باتیں نفسوں میں ہیں انکو اگر تم زبان وغیرہ سے ظاہر کروگے یا کہ دل میں پوشیدہ رکھو گے، حق تعالیٰ دونوں حالتوں میں تم سے حساب لیں گے۔ پھر بجز کفر و شرک کے جسکے لئے ام ہم بخشنا منظور ہوگا بخشدیں گے۔ اور جسکو منظور ہوگا سزا دیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری ق

حاصل یہ نکلا کہ قانون الٰہی دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی طرح فقط آدمی کے ظاہر اور جسم پر ہی نہیں چلتا بلکہ بدن سے لے کر قلوب و ارواح اور نیات پر لاگو ہوتا ہے۔ پس ظاہر شریعت کی رو سے تو شراب و زنا کبیرہ گناہ تھے اور اُن کے ظاہری وسائل صغیرہ گناہ جن پر ظاہری حدود و تعزیرات جاری ہوتی تھیں۔ لیکن حاکم حقیقی حق تعالےٰ شانہٗ کی عظمت و جلال اور ظاہر و باطن میں اُس کے حاضر و ناظر ہونے کی حیثیت سے یہ خیالی زنا و شراب بھی اہل باطن کے نزدیک اکبر الکبائر کہلائے گا جس پر باطنی سزا مرتب ہوگی۔

آداب کے سلسلہ میں یہ دو مثالیں منہیات کی عرض کی گئیں، یہی صورت مامورات کی بھی ہے کہ اُن میں بھی آداب کا ایک سلسلہ ہے جو اصل مقاصد اعمال کے تحفظ کا ضمانت دار ہے۔ مثلاً نماز کا فعل مقصود اصلی ہے جو حقیقی عبادت ہے لیکن اُس کی تسہیل اور تحفظ کے وسائل بلکہ دواعی میں مثلاً جماعۃ ہے جو موجب پابندیٔ نماز اور باعث ترقی اجر و قرب ہے۔ تو وہ سنت مؤکدہ قرار دی گئی پھر جماعت کی تیاری کے لئے اذان کی ٹوہ اور اجابت مؤذن (یعنی کلمات اذان سُننا اور مؤذن کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے اونہیں دوہرانا) مستحب قرار دیا گیا جس سے شرکت جماعۃ کا اہتمام پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس اجابت اذان کے لئے مستعد ہونے کا ذریعہ طہارۃ اور ضروریات سے فراغت ہے تاکہ نشاط کے ساتھ اجابت مؤذن اور حاضریٔ مسجد کی توفیق ہو۔ تو اُس کی بھی ترغیب و تاکید کی گئی۔ غرض درجہ بدرجہ اہتمام طہارت وسیلہ ہے اجابت مؤذن کا۔ اور اجابت مؤذن وسیلہ ہے مسجد کی طرف توجہ کرنے کا اور توجہ مسجد وسیلہ ہے اقدام جماعۃ کا۔ اور یہ اقدام جماعۃ وسیلہ ہے پابندیٔ صلوٰۃ کا جو اصل مقصود ہے۔ اس لئے نماز کے اجر کے ساتھ ساتھ ہی ان وسائل کا اجر بھی وابستہ فرمایا گیا۔ طہارۃ کو نصف ایمان

اور تنزیل معاصی قرار دیا گیا، اجابت مؤذن کے اختتام پر قبولیت دُعاء کا وعدہ دیا گیا، حاضریٔ مسجد کے اقدام پر قدم قدم پر ایک نیکی لکھے جانے اور ایک ایک بدی مٹا دیئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا۔ حاضریٔ مسجد اور انتظار صلوٰۃ کو حکم میں صلوٰۃ کے رکھا گیا۔ شرکت جماعت پر ستائیس درجہ اجر و ثواب کے اضافہ کا وعدہ فرمایا گیا۔ اور اصل نماز کو نور اور دستاویز ایمان کہہ کر اُسے فحش و منکر سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا جس سے نفس انسانی پاک اور مہذب ہو جائے۔

پس مقصود تو نماز کا فعل ہے مگر یہ تمام اُمور چونکہ اُسکی تحصیل و تکمیل کے وسائل اور حدود ہیں اس لئے یہ سب نماز کے آداب کہلائیں گے۔ اگر ان کا اہتمام کیا گیا تو نماز قایم رہے گی ورنہ ضائع ہو جائے گی، اور آدمی کو اُس کی پابندی نصیب نہوگی۔

پس ادب کا حاصل یہ نکل آیا کہ وہ سلسلۂ مامورات میں تو محافظ فرائض ہے اور سلسلۂ منہیات میں مدافع محرمات ہے۔ فرائض کے آداب امتثالی حدود کہلائیں گے، اور محرمات کے آداب کو احترازی حدود کہا جائے گا۔ محرمات کے آداب بجالانے سے تو محرمات سے بچاؤ میسر آئے گا اور فرائض کے آداب بجالانے سے فرائض میں جماؤ میسر آئے گا۔ فرائض کے آداب کی پابندی فرائض کی محبت دل میں جاگزیں کرے گی اور محرمات کے آداب کی پابندی محرمات سے نفرت دل میں بٹھائے گی۔ اس لئے فرائض کے آداب تو درحقیقت تحلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس انسانی آراستہ ہوتا ہے، اور محرمات کے آداب تخلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس کے جبلی عیوب و نقائص زائل ہوتے ہیں۔ اور اس طرح آداب کی ترکیبی نوع تو نفس کو مانجھتی اور صاف کرتی ہے اور فعلیاتی نوع اُس پر قلعی کر کے اُسے چمکاتی ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ ان آداب کی محرومی سے نہ فرائض باقی رہ سکتے ہیں نہ محرمات گویا تارک آداب درحقیقت تارک فرائض و محرمات اور بالفاظ دیگر تارک شریعت ہے۔ اسی لئے کتاب و سنت نے ان آداب اعمال کی طرف خاص توجہ کی ہے اور ہر باب میں آداب کا ایک عظیم ذخیرہ پیش کیا ہے جس میں بعض آداب قرآن و حدیث کی عبارت میں صراحۃً موجود ہیں اور بعض اُن کی دلالت و اشارت اور اقتضاء میں پنہاں ہیں۔ جو بغیر فقہاء ملت اور حکمائے امت کی مدد کے ہر کس و ناکس کے سامنے نہیں آسکتے۔ اسی لئے بطور مثال ہم نے تخیلاتی معاصی کی مثالیں پیش کیں، تاکہ آداب کی اس نوع کی طرف بھی قلوب کی توجہ رہے۔ اور یہ بغیر فقہائے اُمت کا دامن سنبھالے ہوئے میسّر نہیں آسکتی۔

الفاظ پرست اور بے بصر لوگ جو شرعی پابندیوں کا جُوا یا سرے سے اپنے کندھوں سے اوتار پھینکنا چاہتے ہیں یا شریعت کے الفاظ کی آڑ لیکر کم از کم اپنے باطن کو اُس کی باطنی قیود و بند سے آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں ممکن ہے کہ فقہاء کے ان دقائق کو شرک فی النبوۃ وغیرہ کے کریہہ الفاظ سے تعبیر کر کے اُن کی علمی کاوشوں اور تنسیقی ریاضیتوں کی بے قدری کریں۔ لیکن حقیقت شناس مبصر جو ان شرعی حکماء اور دینی فلاسفہ کے بلند مقام سے کسی حد تک بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان فقہاء نے نہ صرف شرعی احکام ہی کو سمجھا ہے بلکہ احکام کے ظاہری و باطنی سلسلوں کو بھی سمجھا ہے اور اس لئے وہ صرف حکم شرعی ہی بیان کر دینے پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ وہ حکم کے سلسلہ سے جڑے ہوئے تمام ظاہری و باطنی مراتب احکام اور اُن کی اُن آخری اور احتیاطی حدود کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں جو بظاہر نظر شرعی تعبیرات میں نظر نہیں آتیں مگر اُن کے معانی اور مدلولات میں اس طرح لپٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے الف با کے بتیس حروف میں ہزارہا کلمات و عبارات لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور جس طرح الف با سے گذر جانے والا مبصر ہی ان حروف کی ترکیب و تحلیل سے مختلف معانی نمایاں کر دیتا ہے جن کو قاعدہ بغدادی پڑھنے والا سمجھ بھی نہیں سکتا، ایسے ہی یہ معانی شرعیہ کے مُبصر شریعت کی ان ہی جامع تعبیرات سے اُن میں لپٹی ہوئی مختلف حدود اور مخفی احکام کو اپنے روشن فہم اور گہرے ذوق سے باہر کھینچ لاتے ہیں جن تک مبتدیوں اور مدعیوں کی نگاہ تک بھی نہیں پہونچ پاتی۔ پس یہ فقہاء اُمت کسی ناتمام طب کے اطباء کی طرح کسی مریض کے سامنے آجانے پر محض دوا بتلا دینے یا زیادہ سے زیادہ علامات مرض سے صورت مرض

پہچان کر نسخہ نویسی کر دینے تک ہی محدود نہیں رہجاتے بلکہ اُمت کے امراض کے ساتھ اُن کے اسباب و علل اور پھر آثار و نتائج سے باخبر رہکر ہر ہر شرعی دوا کی خاصیت اور اُس کے درجۂ تاثیر کو بھی جانتے ہیں۔ اور وہ بھی سطحی طور پر نہیں بلکہ امراض کے تجزیہ کے بعد دواؤں کا تجزیہ کر کے مرض کے ہر ہر جزو کے مناسب ہی دوا کے ہر ہر جزو کی تشخیص اور دوا و مرض کے اجزاء میں تطبیق دینے کی قوۃ بھی رکھتے ہیں جس سے اُن کا یہ مطب ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتا رہا، اور آجتک بھی دُنیا اپنے مختلف امراض کا علاج اُن ہی کے اُصول و قواعد پر کرتی آرہی ہے تا آنکہ دوست دشمن کوئی بھی اُن کی ان قابل قدر مساعی سے مستغنی بنکر اپنے ایمان کو قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

فقہاء کا یہ وضع احکام شارع بننا نہیں کہ تجویز احکام کا شبہ کیا جائے بلکہ شارع اور شریعت کی ایک گہری معرفت ہے جس سے ظواہر شریعت کے ساتھ مضمرات شریعت بھی اُن کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں اور وہ اُنہیں نمایاں کر دیتے ہیں۔ اِس لئے یہ راسخین فی العلم مجوز احکام نہیں بلکہ مُظہر احکام ہیں۔ اختراع احکام نہیں کرتے بلکہ استنباط کرتے ہیں اور اس لئے اُن کا اتباع اُن کی ذوات کا اتباع نہیں بلکہ بالواسطہ شریعت ہی کا اتباع ہے۔ اِس لئے آداب شرعیہ کے سلسلے میں کتاب و سنت کے منصوص آداب کے ساتھ اجماع و قیاس کے ظاہر کردہ آداب کے ذخیرے بھی پیش نظر رکھے جائیں گے۔ ورنہ ظاہر نُصوص کو لے کر بواطن نصوص کو ترک کر دیا جانا، اور فقہاء کی مساعی سے فائدہ نہ اُٹھانا نہ صرف حرمان ہی ہے بلکہ خُسران بھی ہے۔

پھر ان چاروں شرعی حجتوں کے آداب سے متادّب بنکر اور گویا ذوق ادب کا خوگر ہو کر خود اس متادب پر ہی ادب کی بہت سی ذوقی راہیں کھلتی ہیں جو دوسروں کے لئے خواہ حجۃ نہوں مگر خود اس صاحب ذوق کے لئے حجیت کی کچھ نہ کچھ شان ضرور رکھتی ہیں۔ جو اس صاحب ذوق پر کسی کے قال سے نہیں بلکہ خود اسکے اپنے حال سے نمایاں ہوتی ہیں اور اب وہ حاکم کے حکم ہی کے آگے ادب سے نہیں جُھک جاتا بلکہ منشاء حاکم کے سامنے بھی سر ادب خم کر دیتا ہے بلکہ وہ نہ صرف حاکم حقیقی کی ذات اقدس ہی کا ادب کرتا ہے بلکہ جو بھی اس کے نامزد ہو جائے وہ اُس کے آگے بھی ادب سے گردن جُھکا دیتا ہے، اگر کوئی مکان اللہ و رسول کے نامزد ہو جائے تو وہ اُس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے بیت اللہ و بیت الرسول یا آثار و مشاہد اہل اللہ۔ اگر کوئی شخصیت اللہ و رسول کے نام لگ جائے تو وہ اُن کا بھی ادب کرتا ہے جیسے رسول اللہ اور نائب رسول اللہ۔ اگر کوئی کاغذ یا ورق خدا و رسول کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ اُس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے کتاب مصحف اور کتب حدیث و دینیات۔ غرض ادب کے شرعی طریقوں کی پابندی کے ثمرہ میں بہت سے ذوقی آداب اُس پر منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سے اُن پر عملدرآمد کرنے کے لئے بطوع و رغبت جُھک جاتا ہے گو ظواہر شریعت میں اُن آداب کے الفاظ دستیاب نہوں۔

ہجرت کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دولت خانہ کے نچلے حصّہ میں فروکش ہوئے، بالائی منزل پر وہ اور اُن کے اہل و عیال فروکش تھے، تمام تمام رات حضرت ابو ایوب مکان کے ایسے کونے میں سُکڑ کر بیٹھے رہے جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کی سیدھ میں نیچے ہوں گے۔ حالانکہ ظاہر شریعت میں نہ اُنھیں اس کا امر تھا اور نہ ہی وسط مکان میں رہنا اُن کے لئے ممنوع تھا۔ مگر ذوقِ ادب نے اس طرز عمل پر اُنھیں مجبور کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ کے موقعہ پر صلح نامہ میں سے اپنے نام مُبارک کے ساتھ لکھے ہوئے لفظ رسول اللہ، کو محو کر دینے کا حکم دیا۔ مگر حضرت علیؓ نے صریح حکم کے باوجود اس کی جرأت نہیں کی۔ تو یہ ذوقِ ادب ہی مانع تعمیل ہوا، جو ہزار تعمیلوں سے بڑھ کر تعمیل و طاعۃ تھی۔

امام ابو حنیفہؒ زیارت، مدینہ کے موقعہ پر گیارہ دن مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے مگر بول و براز نہ کیا محض اِس جذبۂ ادب سے کہ مدینہ کی پاک زمین کو جو مسکن نبی اور مرقد صحابہ ہے، میں کس طرح آلودہ کروں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر یہ ادب حال تھا رسم مقال نہ تھا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو امام دار الہجرۃ ساری عمر مدینہ میں گزاری اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہو گئے۔ لیکن اس پورے حصۂ عمر میں مدینہ کی گلیوں میں جوتہ پہن کر کبھی نہیں گھومے کہ ایسا نہ ہو میری جوتیاں اُس مقام پاک پر پڑ جائیں جہاں حضورؐ کا قدم مبارک پڑا ہو ظاہر ہے کہ یہ محض جوشِ ادب تھا جو ذوقی طور پر بطور حال کے دل میں جوشزن تھا۔ ظواہر شریعت میں اس کا امر کہیں بھی لفظوں میں ذکر نہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ نے مکہ معظمہ میں ہجرت فرما کر عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتہ نہیں پہنا، کہ یہی رنگ غلافِ کعبہ کا ہے، میں اُسے اپنے پیروں میں کیسے ڈالوں؟ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا۔ مگر ادب کا ایک حال تھا جو قال سے بالاتر تھا۔

حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی دار العلوم دیوبند حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے کلیر شریف جاتے تو رڑکی سے پانچ میل پا پیادہ ننگے پیر سفر فرماتے۔ ظاہر ہے کہ شریعت کی نصوص میں اس قسم کا کوئی امر موجود نہیں مگر متبعین اوامر کا ذوقی اور وجدانی جذبہ ہے جو اُن کی ذات کی حد تک اونھیں ان آداب پر مجبور کرتا تھا۔

حضرت مولٰنا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کو روضۂ اقدس کی گیلری کا جھڑاون (جھاڑو کے ذریعہ جمع شدہ خس و خاشاک اور مٹی وغیرہ) مل گیا تو اُسے پسوا کر اپنے سرمہ میں شامل کیا اور عمر بھر اُس کی سلائی آنکھوں میں پھیرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتیں شرعی احکام کی نہ تھیں، ذوقی جذباتِ ادب تھے، جو آدابِ شرعیہ کی مشق سے بطور ملکہ کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ اور ان مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بلاشبہ یہ تقلید و اتباع یا دعوت دینے کی چیزیں نہیں مگر آداب کا مبصر اور صاحب حال بنجانے پر خود بخود عمل میں آنے کی چیزیں ہیں جن سے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں۔ کیوں کہ یہ اس اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ اور نتیجہ ہے اس لئے واجب الاحترام اور لائق صد ادب ہی نہیں بلکہ درجۂ حال میں قابل اتباع و پیروی بھی ہے۔

حاصل یہ نکل آیا کہ جن آداب کو لے کر علماء اسلام اُٹھے اور جن آداب کی دعوت شریعت اسلام نے پیش کی، خواہ وہ شرعی عبارات میں نمایاں ہوں یا اُن کی دلالت و اشارات میں مخفی ہوں، اور یا اہل اللہ کے پاک ذوق و وجدان سے نکلیں وہ لفظی آداب اور سطحی رسوم نہیں کہ اُن کے اجزاء ترکیبی کلام کی صنعت گری تزئین بیان، لفظوں کی شائستگی اور برجستہ گوئی یا مروجہ رسوم ادب کی ڈھونگ بندی اور رواجی ڈھنگوں پر لفظ و بیان کے مقررہ کلمات ادا کر دینا یا سر جھکا دینا ہوں بلکہ وہ حقیقی ادب ہے جس کے اجزاء ترکیبی فکر و نظر کے ساتھ نصوص کے بعید سے بعید محتملات کی تعمیل، احتیاطی حدود پر عملدرآمد، تہذیب عمل کے ساتھ تہذیب خیال و تصور، ریاضت نفس، مجاہدۂ عمل، تادیب جوارح، تزکیۂ باطن، تصفیہ قلب اور لوجہ اللہ، ترک شہوات و لذات ہیں۔ یہی ادب ہے جو انبیاء نے اختیار کیا۔ صلحاء نے لیا۔ صدیقین نے اُسے اپنایا۔ اور اسی کے ذریعہ سے اپنے دین و دیانت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔

اِس مقامِ ادب پر پہونچکر نہ عبارت آرائی باقی رہتی ہے نہ تزئینِ الفاظ و فقرات نہ شستہ کلامی کے جذبات قائم رہتے نہ سلاست بیانی کے نہ مروجہ رسوم ہیئتہ و بدن باقی رہتی ہیں نہ بناوٹی تعظیم و توقیر، بلکہ سادگی و بے تکلفی کے ساتھ حقیقی عظمت و ادب اور حقیقی اظہار ضمائر باقی رہجاتا ہے جس میں زینت کے بجائے خلوص، آرائش کے بجائے محبت و عشق اور زیبائش لفظ و بیان کے بجائے فنائیت و محویت باقی رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس مرحلہ پر پہونچکر بھرپور کلام و بیان کو حدیث نبویؐ میں نفاق سے اور عجز بیان کو (جبکہ حق کی عظمت و رعب حیرت میں ڈال کر زبانوں کو گنگ بنا دیتی ہے) ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ عشق کیلئے زبان کی ضرورت نہیں وہ خود اپنے مقصد کا اظہار ہے اور وہاں اعلان ادب کی ضرورت نہیں کہ وہ خود ہی ایک مستقل ادب بلکہ سرچشمۂ ادب ہے ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است ✤ عشق را خود صد زبان دیگر است

۵ بوئے او دلبر چو پرّاں می شود
ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

رسمی علم و ادب کو حدیث نبوی میں تجمل اور زینت بدن بتلایا گیا ہے۔ علامات قیامت میں سے ایک بڑی علامت یہ ہی فرمائی گئی ہے کہ لوگ اپنے علم سے تجمل اور زینت حاصل کرنے لگیں اور جیسے وہ خوشنما کپڑوں اور آراستہ مکانوں سے زینت حاصل کرتے ہیں اسی طرح علم و ادب بھی محض رونقِ محفل کا آلہ بنکر رہجائے۔ نہ رونق باطن بنے اور نہ باطن نفس میں حقیقی ادب کی جڑیں پھیلیں۔ پس ایسے ادب میں جبکہ جاہلانہ انداز سے محض رسوم شرعیہ کو رواجی اندازوں سے قایم رکھا جاتا ہے، رسوم شرعیہ باقی رہ جاتی ہیں مگر حقائق شرعیہ کلیۃً گم ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے الفاظ و رسوم ادب کا یہ بے رُوح نقشہ، ایک مردار لاشہ کی طرح ہوجاتا ہے جس کا کوئی نفع نہ دُنیا میں ظاہر ہوتا ہے نہ آخرۃ میں۔

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ادب اور رسمی توقیر نہ اہل اللہ اور اہل دل کا ادب ہے، نہ اُن کے شایانِ شان ہے اور نہ ہی اُسے جوہر عمل کہا جاسکتا ہے جس کی شرعی حیثیت سے تحسین کی جاسکے۔ جوہر عمل اور روح تقویٰ وہی ادب ہے جو اُن رسمیات سے بالا رہ کر اپنے اندر ادب کی حقیقی رُوح رکھتا ہو۔ اور شاعرانہ۔ عامیانہ، رسمیانہ متکبرانہ اور منافقانہ رسوم آداب سے بچا کر پیغمبرانہ آدابِ اخلاق، اور منکسرانہ حدود و رسوم پر لگادے تاکہ انسان میں فنائے نفس، اور رضاء حق کے جذبات اُبھر جائیں اور نفس انسانی صحیح معنی میں شائستہ اور ربانی بن جائے جس سے اُسے مطلوبہ سعادت حاصل ہوجائے اور شقاوۃ سے بچکر حقیقی نجات سے ہمکنار ہوجائے + وباللہ التوفیق

قدیم خریداروں کو ضروری اطلاع!

ہندو پاکستان اور جنوبی افریقہ کے جن قدیم خریداروں نے یاددہانی کے باوجود اپنا چندہ نہیں بھیجا ان کا پرچہ بند کرلیا گیا ہے ان حضرات کے پاس کئی کئی رسالے مُفت گئے اور ان کا مالی نقصان دار العلوم کو پہنچا بہت سے حضرات ایسے باقی ہیں جن کے چندہ کا انتظار ہے، لیکن انتظار کے بعد اُن کا نام بھی کاٹ دیا جائے گا۔ یہ حضرات رسالہ سے تعلق خریداری رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے نمبر خریداری کے ساتھ رقم روانہ فرمائیں۔ (ناظم رسالہ)

دُنیا کی مذمّت اور قرآن حکیم

(مولٰنا اخلاق حسین قاسمی الدہلوی)

پچھلے دنوں (نومبر کے آخر میں) اخبارات نے مولٰنا آزاد سُبحانی کی تقریر کے کچھ اقتباسات شائع کئے تھے اور لکھا تھا کہ مولٰنا نے پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"مُسلمانوں کی موجودہ معاشی اور سماجی پستی صرف
اِس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ دُنیا سرائے فانی ہے،
جسے جیسے تیسے گذار لینا چاہیئے۔"

اخبارات نے جن خیالات کو موصوف کی طرف منسوب کیا ہے اگر یہ خیالات فی الواقع موصوف ہی کے ہیں تو ہمیں افسوس ہے کہ مسلمانوں کے ایک مذہبی آدمی نے اسلام کے ایک بُنیادی عقیدہ کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو مدّت دراز سے مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کے علمبردار تقریر و تحریر کے ذریعہ اختیار کرتے چلے آرہے ہیں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ جب سے اقتدار پرست ارباب سیاست کے ہاتھوں دین و سیاست کی تقسیم عمل میں آئی ہے اور خدا پرست اور خدا ترس لوگوں کو اس میدان سے دھکیل کر اس پر خود قبضہ کیا ہے اُس وقت سے برابر اس امر کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو دین و دُنیا کے صحیح تصوّر سے نابلد رکھا جائے۔

ارباب اقتدار نے اس کام کے لئے بزدل اور بندہ زر اصحاب علم و تصوّف کو استعمال کیا، اور انہی کے ذریعہ مسلمانوں میں دینداری کا ناقص تصوّر پھیلا جس میں صرف نماز روزہ اور مخصوص اعمال و اذکار دین داری ٹھیرے اور ان کے علاوہ اجتماعی زندگی اور اس کے اہم تقاضے دُنیا داری میں داخل ہوگئے۔

یہ چیز بالکل الگ ہے اور ہمیں اس تحریف کا اعتراف ہے۔ لیکن مادہ پرستوں کی زبان میں اسلام کے اس اساسی عقیدہ کو بدنام کرنا کہ دُنیا فانی ہے اور حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے اور اِس عقیدے کو مسلمانوں کی سماجی اور معاشی پستیوں کا واحد ذمّہ دار ٹھیرانا نادان اربابِ تصوّف کی پھیلائی ہوئی گمراہی سے فائدہ اُٹھا کر اصل اسلام پر الزام لگانے کی ناکام کوشش ہے۔

مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اس حقیقت کو بخوبی جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظام زندگی مادہ پرستی، اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے اور اس کے ریشہ ریشہ میں افادیت اور مصلحت بینی کا روگ سرایت کرچکا ہے۔

ظاہر ہے کہ مغرب کا یہ فلسفہ حیات سب سے پہلے جس مذہبی عقیدے پر ضرب لگاتا ہے وہ ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ ہے۔

اِسی بُنیاد پر مادہ پرستانہ فلسفہ حیات اور خدا پرستانہ تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہوگیا ہے۔

یورپ کا مادہ پرستانہ فلسفہ حیات

(۱) دنیوی ترقی اور مادی منافع کو منتہائے نظر قرار دیتا ہے، اور اخلاقی اور اُصولی فوائد کو قطعاً بے قدر و قیمت اور لایعنی۔

(۲) اِس فلسفہ حیات کے تحت پرورش پانے والی قوم کا زاویہ نگاہ خالص تاجرانہ ہوتا ہے اور وہ ہر کام میں یہ دیکھتی ہے کہ اسمیں کتنا مالی فائدہ اور کس قدر جاہ و اعزاز ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کام شرعاً جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا ضمیر بھی مطمئن ہے یا نہیں۔

(۳) اس نظام زندگی کے قیام سے محدود معاشی ترقی کے ساتھ قوم میں عام اخلاقی انحطاط پھیل جاتا ہے اور وہ قوم ایک بااصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے

گر گیا ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت، اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر اُتر آتی ہے۔

اس کے برعکس خدا پرستانہ فلسفہ حیات

(۱) اخلاقی اور رُوحانی اقتدار کو مادی منافع پر ترجیح دیتا ہے۔

(۲) اس میں اصل قدر وقیمت سیرت کی مضبوطی، اخلاقی استقامت اور اصول کی پابندی کی ہے، اور اس میں بے اصولیوں، اخلاقی گراوٹ، ضمیر فروشیوں اور عقیدہ ومسلک کی نیرنگیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں،

مختصر یہ کہ

ایک فلسفہ زندگی یہ کہتا ہے کہ زندگی صرف دُنیا کی زندگی ہے اس کے علاوہ کوئی زندگی نہیں، لہٰذا کھاؤ، پیو، عیش کرو۔ عیش و عشرت میں اخلاق، شرافت، انسانیت اور دوسرے کے حقوق جو چیز بھی آڑے آئے اسے روند ڈالو۔ ع

"بابر بعیش کوش کہ دُنیا دوبارہ نیست"

دوسرا فلسفہ زندگی یہ کہتا ہے کہ:۔

دُنیا کا جینا عارضی ہے، حقیقی جینا آخرت کا ہے جو اس کے بعد شروع ہوگا، یہ فانی ہے اور وہ باقی ہے، لہٰذا عارضی عیش و خوش حالی کو اسی حد تک روا سمجھو جس حد تک اخلاق و انسانیت اسے روا کہیں اور دوسروں کی اس میں حق تلفی نہ ہو تاکہ اس پابندی سے آخرت کی حقیقی زندگی سنور جائے۔

پہلے فلسفہ زندگی کی ہلاکتیں آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور دوسرے فلسفہ زندگی کی برکتیں تاریخ کے ناقابل فراموش واقعات ہیں۔

اس اجمال سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دُنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی اصل مقصودیت کا عقیدہ ترک دُنیا کا سبق نہیں دیتا بلکہ عشق دُنیا سے روکتا ہے۔

تفصیلات سے قطع نظر ہر وہ شخص جو اسلام کے متعلق صرف اتنی بات جانتا ہے کہ اسلام دین کامل ہے، مکمل نظام حیات ہے، تمدن و سیاست، معیشت، اور معاشرت ہر شعبہ زندگی میں نوع انسانی کا ہادی ہے ——— وہ شخص کبھی یہ بات منہ سے نہیں نکال سکتا کہ اسلام انسان کو دُنیا سے بے تعلق بنا دیتا ہے۔

اسلام تو ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کو شر و فساد سے پاک کرے پھر بھلا وہ مسلمان کو معاملات دُنیا سے کنارہ کشی کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔

آئیے اب تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے کتاب اللہ کا مطالعہ کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الاسلام حضرت امام ولی اللہ الدھلوی کی حسب ذیل تحقیق پر ایک نظر ڈال لیں، جو کتاب وسنت کی مختلف نصوص کو باہم منطبق کرنے کا بہترین اصول پیش کرتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب اقتصادیات پر بحث کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص۱۰۲ پر فرماتے ہیں:۔

انبیاء علیہم السلام کے آنے کا اصل مقصد اگرچہ عبادت الٰہی کے صحیح طریقوں کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اسی کے ساتھ فاسد رسموں کو مٹانے کا اہم کام بھی انجام دیتے ہیں، اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ معیشت و معاشرت کے اچھے طریقے اختیار کریں۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

بعثت لمحق المعازف۔ "میں لہو ولعب کے آلات کو مٹانے آیا ہوں"

اور فرمایا:۔

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ "میں اچھی عادات اور عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں"

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ کا منشاء یہ نہیں ہے کہ انسان تمدن و سیاست، معاش و معاشرت کے تمام معاملات سے کنارہ کرکے گوشہ نشین ہو جائے، کسی پیغمبر نے بھی ترک دنیا کا حکم

نہیں دیا، جو لوگ دُنیا کے جھمیلوں سے گھبرا کر پہاڑوں کی طرف بھاگ جاتے ہیں، بھلائی اور بُرائی میں لوگوں سے میل جول ترک کر دیتے ہیں، وہ صحیح راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

اسی بناء پر حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

ما بعثت بالرھبانیۃ وانما بعثت بالملۃ الحنیفیۃ السمحۃ۔ "میں ترک دنیا کی تلقین کرنے نہیں آیا، میں تو اُس دین کو لیکر آیا ہوں جو سراپا سچائی ہے اور بہت آسان ہے"

البتہ انبیاء علیہم السلام کا ہمیشہ یہ پروگرام ضرور رہا ہے کہ تمدن و سیاست کے جملہ معاملات میں اعتدال قائم ہو جائے یعنی نہ تو لوگ عیش و آرام کے حصول میں اس قدر منہمک ہو جائیں کہ انکی پوری زندگی شاہان عجم کی طرح شعر، شکار اور شراب میں گذر جائے اور نہ عوام راہبوں اور جوگیوں کی طرح غاروں اور ویرانوں میں جا بیٹھیں۔

اس معاملہ میں ۲ دو نقطہ نظر ہو سکتے ہیں:۔

ایک یہ کہ:۔

آسودہ حالی اور آرام سے زندگی بسر کرنا بہت اچھا ہے اس لحاظ سے کہ اس حالت میں انسان کی ذہنی کیفیت درست رہتی ہے، عقل صحیح کام کرتی ہے، اخلاق میں راست بازی پیدا ہو جاتی ہے اور انسان ایسے اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے جو اسے اپنے ابنائے نوع سے ممتاز کر دیتے ہیں۔

برعکس اس کے اگر انسان بدحالی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اسمیں خسیس اوصاف کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ:۔

آسودہ حالی اور دولت کی فراوانی جھگڑوں کی جڑ ہے، اس سے سینکڑوں خرخشے پیدا ہو جاتے ہیں، انسان خوش حال زندگی میں مست ہو کر آخرت کی تیاری سے غافل ہو جاتا ہے۔

پہلے نقطہ نظر میں خوش حال زندگی کے فائدے پیش کئے گئے ہیں، اور دوسرے میں خوش حالی کے نقصانات دکھائے گئے ہیں۔

دین فطرت کے سامنے خوش حال زندگی کے دونوں پہلو ہیں، اس نے خوش حالی کے فوائد کا اعتراف کیا اور اسکی مضرتوں کا علاج کرنے کے لئے خوش حالی کے ساتھ کچھ "اذکار و آداب" کا پیوند لگا دیا۔ یعنی شریعت نے خوش حالی اور عیش و آسودگی کے باب میں کچھ ایسی ہدایات دیدیں اور کچھ ایسی نصیحتیں فرما دیں جن کے پیش نظر رکھنے سے خوش حالی کی مضرتوں اور اس کے نقصانات سے انسان محفوظ رہ سکتا ہے۔

واضح ہو کہ جب روم و عجم کے لوگوں میں دولت و سلطنت مدت تک منتقل ہو کر چلی آئی تو یہ لوگ حکومت کے نشہ میں بالکل مست ہو گئے اور فکر آخرت ان میں قطعاً باقی نہ رہا مادیات میں ان کا انہماک اِس قدر بڑھ گیا کہ ہر شخص مادی ترقی پر ناز کرنے لگا، وہ لوگ حقیر سمجھے جاتے، جو محل و محلوں باندی غلاموں، وسیع دستر خوانوں، اور پُر شوکت لباسوں، سے محروم ہوتے۔

عیش و عشرت کی فراوانی جب اِس درجہ پر پہونچ جاتی ہے تو نظام معیشت میں سخت فساد برپا ہو جاتا ہے، کاشتکاروں تاجروں، اور صنعت کاروں پر طرح طرح کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں، اُنہیں تنگ کیا جاتا ہے، پھر مُلک میں بغاوتیں اُبھرتی ہیں، کیوں کہ اگر بغاوتیں نہ اُبھریں تو عیش پرست حکام غریب عوام کو بیل اور گدھے کا درجہ دے دیں۔

جب کسی مُلک کے خواص میں تعیش اس قدر بڑھ جاتا ہے تو وہاں کے عوام بھی مجبور ہو کر اُن کی تقلید کرتے ہیں، اگر وہ ان کا معیار زندگی اختیار نہ کریں تو خواص کی بارگاہ میں انہیں باریابی کا موقع نصیب نہ ہو۔

ایسے حالات تھے کہ خدا تعالےٰ نے رسول عربی کو مبعوث فرمایا، جس نے عجمی رسموں کی مذمت کی اور دنیوی زندگی میں مستغرق ہو جانے کی قباحتیں ظاہر فرمائیں۔

مطلب یہ ہے کہ شریعت نے "دُنیا کی تحقیر" کرکے انسان کو دنیوی عیش و عشرت میں منہمک ہونے سے روکا ہے

اور اس سے باز رکھا ہے کہ انسان مادیات میں مشغول ہو کر اخلاق و روحانیت کے اعلیٰ مقاصد سے غافل ہو جائے۔

اس سلسلہ میں جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو تین قسم کی آیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

(۱) وہ آیات جن میں دُنیا اور طالبین دُنیا کی مذمت اور تحقیر کی گئی ہے۔

(۲) وہ آیات جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کونسے طالبین دُنیا قابل مذمت ہیں۔

(۳) وہ آیات جن میں مال و دولت کو خیر اور فضل کہا گیا ہے، اور دنیوی نعمتوں کو تابعدار بندوں کا حق قرار دیا گیا ہے۔

اِن آیات پر جب ہم اِسی ترتیب سے غور کرتے ہیں تو بغیر کسی مدد کے صرف قرآن ہم کو یہ بتاتا ہے کہ دُنیا کی تحقیر سے اسلام کا منشار کیا ہے؟ ——— آئیے اب غور کریں۔

وہ آیات جن میں دُنیا اور طالبین دُنیا کی مذمت اور تحقیر کی گئی ہے۔

(۱) زین للذین کفروا الحیٰوۃ الدنیا ویسخرون من الذین اٰمنوا والذین اتقوا فوقهم یوم القیامة۔ (بقرہ رکوع ۲۶)

"فریفتہ کیا ہے کافروں کو دُنیا کی زندگی پر، اور ہنستے ہیں وہ ایمان والوں پر، اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بہتر ہوں گے قیامت کے دن۔"

یعنی جن لوگوں کی نگاہ میں حیات دُنیا اسقدر حسین ہے کہ وہ اسکی خاطر ایمان و عمل کو چھوڑے بیٹھے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ ایمان و عمل کو اصل مقصود سمجھتے ہیں اور دنیوی سامان کو صرف حصول مقصود کا وسیلہ، تو یہ لوگ اُن اصحاب ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور انہیں بے وقوف قرار دیتے ہیں۔

(۲) زین للناس حب الشھوٰت من النساء والبنین والقناطیر المقنطرة من الذھب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ذالك متاع الحیٰوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب۔ (آل عمران ع ۲)

"فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے جیسے عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کئے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور مویشی اور کھیتی یہ فائدہ اُٹھانا ہے دُنیا کی زندگی میں اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانا"

یعنی انسان فطرۃً دنیوی سامان کی طرف رغبت و میلان رکھتا ہے، اور فطرت انسانی میں ان چیزوں کی محبت اِس لئے رکھی گئی ہے، تاکہ ان چیزوں میں اس کا امتحان لیا جا سکے۔

پس جو شخص ان چیزوں کو مقصود اصلی سمجھ کر ان کی خاطر اخلاق اور شرافت انسانی کے تمام تقاضوں کو نظرانداز کر دیتا ہے وہ امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے اور جو شخص دین فطرت کی ہدایات کے مطابق بیوی بچوں اور مال و دولت کے ذریعہ انسانیت، تمدن اور سماج کی خدمت کرتا ہے وہ امتحان الٰہی میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اِمتحان میں کامیاب ہونے والے وہی لوگ ہیں جو ہر وقت یہ پیش نظر رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ برتنے کا عارضی سامان ہے مستقل ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

(۳) فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقد فاز وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ (آل عمران ع ۱۹)

"پھر جو کوئی دُور کیا گیا دوزخ سے اور داخل کیا گیا جنت میں اس کا کام تو بن گیا، اور نہیں زندگانی دُنیا کی مگر پونجی دھوکے کی۔"

یعنی مادی شان و شوکت میں بڑا دھوکا ہے، اگر انسان اسی کو منزل سمجھ کر اسی میں اُلجھ جائے تو برباد ہو جائے، اُس مسافر کی طرح جو راستے کے پُربہار مناظر سے دل لگا لے اور منزل کی طرف بڑھنے اور مقصود تک پہنچنے سے رہ جائے۔

(۴) وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب قل متاع الدنیا قلیل والاٰخرة خیر لمن اتقی (نساء ع ۱۱)

"اور کہنے لگے اے رب ہمارے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک کہدے کہ فائدہ دُنیا کا تھوڑا ہے اور آخرة بہتر ہے پرہیزگار کو۔"

یعنی جو کچے مسلمان حال کے آرام و راحت کی خاطر جہاد سے جی چراتے ہیں وہ مستقبل فائدوں سے محروم رہجاتے ہیں، اپنا اور اپنی قوم کا مستقبل تعمیر کرنے کے لئے حال کے حقیر فائدوں کو وہی لوگ قربان کر سکتے ہیں جو اس نظریہ پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کی زندگی تو عارضی ہے، اس کا عیش و آرام بھی فانی ہے، پائیدار عیش تو آخرت کی زندگی کا ہے، جو مخصوص ہے اُن لوگوں کے لئے جو پرہیزگارانہ روش رکھتے ہیں۔

(۵) وما الحیوۃ الدنیا الا لعب و لھو وللدار الاخرۃ خیر للذین یتقون، افلا تعقلون (انعام ع ۴)

"اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور جی بہلانا اور آخرت کا گھر بہتر ہے پرہیزگاروں کے لئے، کیا تم نہیں سمجھتے"

مادہ پرست کہتے تھے، ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین۔ "ہمارے لئے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی اور ہم کو پھر نہیں زندہ ہونا"

اس آیت میں ان کے خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ جو زندگی مالک الملک کے روبرو اعمال کی جوابدہی کے تصور سے خالی ہوتی ہے وہ صرف کھانے پینے اور عیش کرنے میں بسر ہوتی ہے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی جدوجہد کا اس زندگی میں قطعاً نام و نشان نہیں پایا جاتا، پس اس قسم کی زندگی کو کھیل کود تو کہا جا سکتا ہے، حقیقی زندگی نہیں کہا جا سکتا۔

(۶) المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابا وخیر املا (کہف ع ۶)

"مال اور بیٹے رونق ہیں دنیا کی زندگانی میں اور باقی رہنے والی نیکیوں کا بہتر ہے تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر ہے توقع"

(۷) اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد۔ (حدید ع ۳)

"جان رکھو کہ دنیا کی زندگانی یہی ہے کھیل اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں اور بہتات ڈھونڈنی مال کی اور اولاد کی"

(۸) انما اموالکم و اولادکم فتنۃ واللہ عندہ اجر عظیم۔ (تغابن ع ۲)

"تمہارے مال اور تمہاری اولاد بھی ہیں جانچنے کو اور اللہ جو ہے اس کے پاس ہے ثواب بڑا"

مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد تو دراصل آزمائش کا سامان ہے اگر انہیں خدا کی خوشنودی اور اس کے بندوں کی خدمت کے اعلیٰ مقاصد کے راستہ پر ڈالا جائے گا تو وہ باقیات الصالحات (باقی رہنے والی نیکیوں میں) شمار ہوں گے اور اگر نیک مقاصد کا وسیلہ نہ بنایا جائے گا تو یہ سب محض عارضی رونق اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی چیزیں ہوں گی جن میں سے بغض و حسد، فخر و غرور اور حرص و طمع کی بیماریاں پھوٹیں گی اور یہ بیماریاں زندگی کے امن و سکون کو غارت کر کے رکھ دیں گی، اسی لحاظ سے سورۂ تغابن میں مال و اولاد کو دشمن (عدو الکم) فرمایا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: "فلسفۂ نعمت مصیبت"

ادراک کی طاقت ہو نہ کہ عمل کی قوۃ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قوۃ کا مرکز اور مستقر وجود کا ایک اعلیٰ حصّہ ہے جسے ابھی ہم نے ملائکہ کے عنوان سے تعبیر کیا ہے لیکن اس سے اس دعویٰ میں فرق نہیں پڑتا کہ یہ طاقت تمام اجزاء کائنات میں بکھری ہوئی ہے خواہ وہ اسی مستقر سے پھیلتی اور بکھرتی ہو، اور انہی ملائکہ کا فیض ہو، جیسے حواس کے فیض سے پورے بدن میں حس و ادراک کی طاقت پھیلی ہوئی ہو گو ان کا مستقر مخصوص ہو، یہی وجہ ہو کہ ہر جزو کائنات کو اپنے طبعی وظائف کا شعور ہے خواہ وہ کہیں تکوینی رنگ کا ہو اور کہیں تشریعی رنگ کا خواہ وہ کسی نوعیت کا بھی ہو۔ ارشاد ربانی ہے:۔

ربنا الذی اعطیٰ کل شیء خلقہ ثم ھدیٰ۔

"ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی، اور پھر اسے ہدایت فرمائی"

پھر یہ شعور و ادراک خلقت کے بعد پروردگار کی ہدایت قبول کر لینے ہی تک محدود نہیں بلکہ اس ہدایت کی تعمیل کا بھی ہر مخلوق میں جذبہ اور داعیہ ہے اور وہ اُس جذبہ کو عملاً ظاہر کر کے ہی اپنی اصل (حق تعالیٰ) سے وابستگی دکھلا سکتی ہے۔

(باقی آئندہ)

(دُوسری قسط)

حکیمُ الاُمّت حضرت مولٰنا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

(احسان الحق قریشی سیالکوٹ)

حضرت والا ۱۹۳۸ء میں لاہور تشریف لانے والے تھے سفر کا سلسلہ تو حضرت نے عرصۂ دراز سے ترک کر دیا تھا مگر سالہا سال کے بعد حضرت نے اب سفر کا ارادہ فرمایا تھا۔

آپ کو لاہور میں ڈاکٹر جلال الدین صاحب ماہر امراض دندان سے دانتوں کے سلسلے میں کچھ مشورہ لینا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت کے سچے عاشقوں میں سے ہیں اور انہی کے بار بار عرض کرنے پر حضرت نے سفر کا ارادہ فرمایا تھا۔ اِس سفر کی روئیداد ایک کتابچہ کی شکل میں بھی صفحۂ قرطاس پر آچکی ہے۔ جس دن حضرت مولٰنا لاہور سے امرتسر ڈاکٹر صاحب کی کار میں تشریف لائے وہ دن مجھے تاعمر نہیں بھولے گا۔ ۱۹۳۸ء کی گرمیوں کے دن تھے۔ حضرت کو اپنے ایک عاشق صادق مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ العالی کے دولت خانے پر قیام کرنا تھا مفتی صاحب کے صاحب زادے مولٰنا عبید اللہ صاحب (جو کہ جوانی میں بھی "در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری" کے مصداق ہیں) اور راقم الحروف دونوں انتظام میں مصروف تھے۔ خلقت تھی کہ حضرت کی تشریف آوری کی خبر سنکر اُمنڈی چلی آتی تھی۔ کیا موافق اور کیا مخالف دونوں طرح کے اصحاب جمع ہو گئے تھے۔ حضرت گرانڈ ٹرنک روڈ شریف پورہ (امرتسر) پر کار سے اُترے۔ اور اصحاب کے ساتھ احقر کو بھی شرف مصافحہ بخشا۔ مجھے اِس وقت تک حضرت کا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہچاننے کی کامیاب کوشش کرنا بخوبی یاد ہے اور وہ وقت یاد کر کے آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں ع "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

اُس دن میں تو اور اصحاب کے ساتھ انتظام میں مصروف رہا اور ادھر مجلس علم و عرفان گرم رہی۔ مفتی صاحب کا روئے مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔ ع

"عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں!!!"

اُس دن حضرت کی مجلس میں مزاح ذرا غالب رہا۔ کبھی کبھی راقم الحروف بھی انتظام سے فارغ ہو کر ایک آدھ فرمودہ سُن ہی لیتا تھا۔ حضرت ایک واقعہ پر ایک لطیفہ کو منطبق فرما رہے تھے۔ واقعہ تو ذہن سے فراموش ہو گیا ہے مگر لطیفہ یاد رہا۔ فرمانے لگے کہ "آقا نے مُلازم کو صراحی لانے کے لئے کہا۔ ملازم صراحی کو گردن سے پکڑ کر لایا۔ آقا نے کہا کہ جس وقت صراحی منگوائی جائے تو دوسرا ہاتھ پیٹ پر بھی رکھ کر لایا کر۔ کچھ دیر بعد پھر صراحی منگوائی گئی، تو ملازم نے اُسی طرح صُراحی کی گردن پکڑی ہوئی تھی مگر ہاتھ بجائے صُراحی کے پیٹ کے اپنے پیٹ پر رکھا ہوا تھا!!!" اگر مجھے وہ واقعہ بھی اِس وقت یاد آجاتا، جس پر حضرت نے یہ لطیفہ منطبق فرمایا تو قارئین بھی یقیناً محظوظ ہوتے۔

عصر کی نماز حضرت نے مسجد نور میں پڑھائی۔ راقم الحروف بھی پہلی صف میں تھا۔ حضرت نے باواز بلند فرمایا کہ "میں مُسافر ہوں، دو رکعت پڑھوں گا، آپ اپنی نماز پوری کرلیں۔" چنانچہ اِسی طرح ہوا۔ بعد میں حضرت نے مولٰنا نور احمد صاحب رح کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ مولٰنا مرحوم کے صاحبزادگان مولٰنا محمد داؤد مرحوم اور مولٰنا محمد سلیمان بی، اے بھی موجود تھے۔ اس کے بعد حضرت کار میں ہی بازار مہان سنگھ کٹڑہ میں

تشریف لے گئے جہاں اُن کے ایک مُرید باصفا حکیم محمد علی صاحب کا مکان تھا۔ حضرت کے تشریف لیجانے کے بعد چند مخالفین احقر سے بحث کرنے لگے کہ حضرت نے امامت فرماتے وقت عصر کے صرف دو فرض کیوں بحیثیت مسافر پڑھے، امامت کے وقت نماز پُوری پڑھانی لازمی تھی؟ دوسرے مولنا نور احمد صاحب کے مزار پر فاتحہ خوانی کے وقت حضرت والا نے ہاتھ کیوں نہ اُٹھائے، بغیر ہاتھ اُٹھائے کیوں فاتحہ پڑھی؟ میں کوئی عالم تو تھا ہی نہیں جو اِن باتوں کا جواب دیتا۔ صرف عالموں کی جوتیاں سیدھی کرنیوالا تھا۔ احقر نے حضرت مفتی صاحب سے مدلّل جوابات دریافت کرکے مخالفین کی تسلی کردی۔

بعد کی کسی ملاقات میں مولسنا محمد داؤد مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ وہ مجھے حضرت کی مجلس میں اُس دن دیکھکر حیران ہو گئے تھے، میں نے وجہ پوچھی تو فرمانے لگے کہ "اس سے پہلے اُنہوں نے احقر کو حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب ثانیؒ کی مجلس میں بھی دیکھا تھا۔"

راقم الحروف یہاں عرض کرتا ہے کہ علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ میں دو حضرات ایک ہی نام کے تھے۔ اُن میں سے زیادہ مشہُور حافظ جماعت علی شاہ صاحب تھے (جن کا انتقال گذشتہ سال ہی ہوا ہے) حافظ صاحب مرحوم اکابر دیوبند کے سلک کے سخت خلاف تھے اور سخت ترین الفاظ استعمال کیا کرتے تھے، مگر دوسرے جن کو پیر جماعت علی شاہ صاحب ثانی کہا جاتا تھا فقیر منش درویش تھے اور نسبتاً کم معروف تھے۔ ایک ہی قصبہ کے ہمنام بزرگوں میں زیادہ مشہور حافظ جماعت علی شاہ ہی تھے۔ ثانی صاحب کا انتقال ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا، اور حافظ صاحب کا ۱۹۵۱ء میں۔ ثانی صاحبؒ نے کبھی بھی اکابر دیوبند کو بُرا بھلا نہیں کہا، بلکہ وہ اکثر مولسنا نور احمد امرتسری کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ احقر کی اہلیہ شروع ہی سے اُن کی مرید تھیں، اور میں بھی کبھی کبھار ثانی صاحبؒ کی مجلس میں جا بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے مولسنا محمد داؤد کو جواب دیا کہ یہی سوال آپ اپنے سے بھی دریافت کیجئے۔ آپ بھی ثانی صاحبؒ کی مجلس میں گئے اور حضرت والا کی مجلس میں بھی۔ اگر آپ اِس فعل کو تضاد سمجھتے ہیں تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟ مرحوم فرمانے لگے کہ "چند مسایل میں ان بزرگوں کا اختلاف تھا اِس لئے میں نے یہ سوال دریافت کیا۔" میں نے عرض کی، چند فروعی مسائل میں تو حضرت حاجی صاحبؒ کا اختلاف حضرت تھانویؒ سے تھا اور حضرت حاجی صاحبؒ نے اِس اختلاف کی اجازت بھی دے رکھی تھی نیز اختلاف تو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بھی تھا، تو کیا ان دونوں قسم کے فرمودات سُننے والے کو آپ الزام دیں گے؟" میرے اِس جواب پر مرحوم فرمانے لگے کہ "تم نے دُرست کہا۔" اور اُن کی تسلی ہو گئی۔

۱۹؍ اور ۲۰؍ جولائی ۱۹۴۳ء (۱۵؍ اور ۱۶؍ رجب ۱۳۶۲ھ) کی درمیانی شب اپنے وطن اور اپنے شیخ حضرت حاجی صاحبؒ کے وطن تھانہ بھون میں ۸۳ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے

انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

سالہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات
تا بزم عشق یک دانائے راز آید برُوں

حضرت والا کی تعلیمات، ارشادات، تصوّف و سلوک، فقہ و تفسیر، حدیث و سنت وغیرہ کے متعلق تفصیل سے کچھ معلوم کرنا ہو تو مولسنا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" لکھنؤ کی تازہ تصنیف "حکیم الامّت" (قیمت آٹھ روپے، دار المصنفین اعظم گڈھ، یو، پی۔ بھارت) پڑھی جائے، یا پروفیسر عبدالباری کی تصنیف "جامع المجدّدین" اور "تصوّف و سلوک" جامع اشرفیہ نیلا گنبد، لاہور سے منگوائی جاوے۔

راقم الحروف مولسنا عبدالماجد دریا آبادی کی تصنیف "حکیم الامت" کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہے جن میں مولسنا نے حضرت کے متعلق کچھ تأثرات بیان کئے ہیں:۔

مولسنا عبدالماجد صاحب دریا آبادی بھی حضرت والا کے خلفاء[عہ] میں سے ہیں، اور ان کے اخبار "صدق" لکھنؤ کا نام انکو

عہ مولسنا عبدالماجد، حضرت مولسنا تھانویؒ سے نہ مجاز بالبیعت ہیں اور نہ مجاز بالصحبت، خاتمۃ السوانح مصنفہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کے اخیر میں مولسنا تھانویؒ کے خلفاء کی جو فہرست درج ہے اس میں بھی مولسنا عبدالماجد کا نام نہیں۔ اور حاشیہ ہے م

م مولسنا عبدالماجد نے بیعت حضرت مولانا مدنی مدظلہ سے کی اور اپنا تعلق حضرت مولسنا تھانویؒ سے رکھا۔ (قیصر)

محتاج تعارف نہیں رہنے دیتا۔

مولانا دریا آبادی کا مکتوب خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؒ کے نام،

کرم گستر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! کیا عرض کیا جائے کن الفاظ میں عرض کیا جائے کہ سانحۂ عظمیٰ کی خبر سُنکر دل پر کیا گذر رہی۔ دل پر میرے ہی نہیں بلکہ میرے گھر بھر کے، بیوی کے بچوں کے۔ تعزیت کروں تو کس سے کہ میں خود ہی مستحقِ تعزیت ہوں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عالمِ اسلامی میں اِس سے بڑھ کر قیامت خیز حادثہ اس وقت اور کیا ہو سکتا ہے۔ دُنیائے اسلام میں سنّاٹا ہو گیا۔ وقت کا سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا عارف محمدؐ کی فوج کا سب سے بڑا کارگزار اور وفادار جنرل رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا۔ ہم بدبخت ایسی نعمت کے اہل ہی کب تھے؟ حیرت اس پر نہیں کہ یہ نعمتِ عظمیٰ اپنے وقت پر واپس لے لی گئی، حیرت تو یہ ہے کہ یہ نعمتِ عظمیٰ اتنے دنوں ہم میں رہی کیسے؟ ع

"تو بہارِ عالم دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی!"

مزارِ اشرف پر حاضری کی تمنّا دل میں عرصہ سے تھی، جولائی کے مہینے سے یہ قرض برابر چلا آرہا تھا۔ نوبت وسط نومبر ۱۹۴۳ء میں آئی، ۱۵ر کی دوپہر سے قبل تھانہ بھون اسٹیشن پر اُترا اور سیدھا مزار پر حاضر ہو گیا۔ تھانہ بھون کی حاضری خدا جانے کتنی بار ہو چکی تھی۔ آج کا سفر ان سارے سفروں سے کتنا مختلف تھا! کیسا قوی اور کامل یقین کہ دوکان کُھلی ہوئی ہے، مطب گرم ہے، جاتے اور پہنچتے ہی مرہم شفا ہاتھ میں ہو گا، ہر درد کی دوا، ہر فکر و غم سے تشفی۔ مگر آج رُت بدلی ہوئی تھی، آج قسمت پلٹی ہوئی تھی۔ دوکان بند، مطب اُجاڑ۔ شفا، کی بجائے حسرتِ شفا، دوا کی جگہ دوا کی یاد۔ مکین کے عوض صرف مکان۔

اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا؟ پورے دو فرلانگ بھی نہیں۔ اور مزار۔ نہ کوئی بلند گنبد نہ کوئی کلس اور قبہ، نہ چار دیواری نہ آستانہ، نہ جنگلہ نہ کٹہرا، ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ، وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک سطح تختہ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ، نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کُھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچّی تُربت، سادگی کی تصویر، صاحبِ قبر کی بے نفسی کا آئینہ!!! نہ لوح نہ کتبہ۔ نہ پھول نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلے پر وصل بلگرامی، اور دوسرے مخلصین کی قبریں تھیں۔ شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست، زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسلین سے پیچھے رکھتے تھے۔ تصوّر کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا تخیّل کے کان میں کیا کیا آوازیں آئیں، کوئی کہے بھی تو کس زبان میں کہے

ع "ایں حدیثے را بیانِ دیگر است"

جی میں آیا کہ مٹّی اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیجئے۔ عقل نے کچھ اور ہی سمجھایا۔ روتی ہوئی آنکھ اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام رخصت عرض کیا، اور اپنے کو خانقاہ امدادیہ تک پہنچایا خانقاہ! آہ رُوحِ بے جسد، و مکانِ بے مکین، وہ انگشتریٔ بے نگین! مدرسہ چل رہا تھا لیکن سہ دری خاموش، ویران، بجھی ہوئی شمع، ایک ہُو کا عالم سنّاٹے کا مقام۔ نہ دری نہ جاجم، نہ تکیہ نہ مسند، نہ ڈسک نہ قلمدان۔ یاد ایک ایک چیز کی آتی رہی، اور دل کو حسرت و عبرت کی ختم نہ ہونے والی داستان سُناتی رہی۔ یُوں آنا ہوتا تھا، یہاں بیٹھنا ہوتا تھا۔

آہ! تو کیا تیرا یہ بندہ بھی فانی تھا؟ بے شک موت و فنا تو اِس نامور خادم (حکیم الامت تھانویؒ) کے نامور آقا (محمدؐ) تک کے لئے مقدر کر دی گئی تھی۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ یہ ایک آیت اُمّت کی تسلّی و تعزیت کی کیسی، پُوری دُنیا کی دُنیا اپنے اندر آباد رکھتی ہے۔ اپنی زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے، بڑے بڑے عابد۔ متقی، تہجد گذار نظر سے گذرے، لیکن اصلاح و ارشاد کی مسند نشینی کا حقدار جیسا حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کو پایا کسی اور کو نہ پایا کتنے ہی بزرگ صورت درویش نما عالم لباس، خرقہ پوش۔ عمامہ بند، ایسے ملے جن کی حقیقت چند مہینوں یا برسوں کے سابقہ کے بعد مخفی نہ رہ سکی۔ حضرت کے ہاں تو نظر سے زندگی بن گئی، بے معنی

زندگی بامقصد ہو گئی۔ ورنہ خدا معلوم مقسوم کہاں کہاں مارا مارا بھٹکتا پھرا تا رہتا۔ حضرت کا اختلاف بھی دوسروں کے اتفاق سے بڑھکر نفع بخش و ہدایت آموز ہوتا تھا۔ اور جب خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے درِ اشرفی سے ناکام جانے والوں کے حق میں کہا کہ:- ع

"میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے"

تو شاعری نہیں کی صرف واقعہ بیان کر دیا۔

بلاکسی استحقاق اور جہد و طلب کے یہ نعمت جاں نواز کچھ کم شامل حال رہی کہ اتنے ہی دن کی خدمت و صحبت نصیب ہو گئی یہ اور بات ہے کہ سکندر آبِ حیواں تک رسائی پا جانے کے بعد بھی پیاسے کا پیاسا واپس ہوا۔

حضرت کی سوانح نگاری کا حق اور لوگ ادا کرینگے۔ حضرت کی مجددانہ مصلحانہ و حکیمانہ تعلیم و تربیت پر بھی وہ لوگ لکھیں گے جو اس کے اہل ہیں۔ اِن صفحات میں تو اس نامہ سیاہ نے صرف وہی لکھا ہے جو کچھ اپنے تجربہ میں براہ راست آیا۔ عارف رومی رح کی زبان میں ع

"اے تو افلاطون و جالینوسِ ما"

یا خسرو دہلوی رح کے

"صد ہزاراں عید قربانت کنم
اے ہلالِ ما خمِ ابروئے تو!"

اب راقم الحروف اپنی عرض کرتا ہے۔ حضرت کے خلفاء تو بے شمار ہیں۔ چند خلفاء مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی رح۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب رح۔ اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے تذکرے اوپر ہو چکے۔ مگر حضرت کے خلیفہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری کا تذکرہ ابھی بہت باقی ہے۔ حضرت والا کے وصال کے وقت احقر ملتان میں تھا، اور وصال کی خبر کے بعد طبیعت کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ رنج والم کے جذبات غالب تھے۔ احقر چھٹیوں میں اپنے وطن امرتسر آیا۔ بعد میں تبادلہ بھی امرتسر ہی ہو گیا۔ ایک رات ارادہ کیا کہ مفتی صاحب کے پاس جا کر درخواست تجدید بیعت کروں۔ صبح حاضر ہونے کے ارادے سے احقر سو گیا۔ رات کو کیا دیکھتا ہوں کہ پہلے تو خانہ کعبہ میں فرائضِ حج ادا کر رہا ہوں، اُس کے بعد مفتی صاحب نے مجھے بیعت کر لیا (اور سامنے حضرت والا بھی بیٹھے ہیں) صبح میں نے اِس اشارے پر عمل کرتے ہوئے تجدید کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اور مفتی صاحب کو بطور جانشینِ حضرت والا ہی سمجھتا رہا، اور ملتا رہا اور تا حال ملتا ہوں۔

گذشتہ سال (ماہ مارچ ۱۹۵۲ء) مفتی صاحب لاہور سے سیالکوٹ برائے علاج تشریف فرما ہوئے۔ ہم لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ روزانہ بعد نماز عصر مجلس علم و عرفان گرم ہوتی اور مجھے تو مفتی صاحب میں حضرت والا کی صورت ہی دکھلائی دیتی۔ حضرت مفتی صاحب کے ارشادات اور فرمودات وہ مزہ دیتے کہ ع

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوسِ چترِ سنجرم
زانکہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب
من ملکِ نیم روز بیک جو نمی خرم

جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں احقر کے والدِ محترم، ہمارے (یعنی احقر کے برادر خورد پروفیسر خالد محمود ایم اے کے) مسلک کو کچھ پسند نہیں فرماتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کا قیام سیالکوٹ قریب اختتام نظر آ رہا تھا، کیونکہ حضرت کو جامعہ اشرفیہ لاہور سے بار بار عرضداشتیں موصول ہو رہی تھیں کہ حضرت جلد واپس تشریف فرما ہوں۔ اِدھر احقر العباد دست بدعا تھا کہ آپ کا قیام اور لمبا ہو جائے۔

ایک دن احقر نے قبلہ والد صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپنے اکابر دیوبند میں سے کسی بزرگ کو آجتک نہیں دیکھا، صرف ہماری خاطر مفتی صاحب کی زیارت کر لیں۔ والد صاحب قبلہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے کبھی سیالکوٹ سے باہر نہیں جایا کرتے اور اپنی ملازمت کے دوران میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس رہے (آجکل پنشن اونر ہیں) میں نے بار بار مجبور کیا کہ آپ صرف دو منٹ ہماری خاطر حضرت کی زیارت سے مستفید ہوں اور بعد میں

خواہ اپنی رائے پر قائم رہیں یا بدل لیں ؎

آج کا دن ہے دل کھول کے مل لیں ان سے
پھر خدا جانے کہ یہ ساماں رہے یا نہ رہے!!

والد صاحب قبلہ نے فرمایا کہ "میں اکیلا ہی جاؤں گا، تم ساتھ مت جانا اور صبح کو جاؤں گا، شام کو نہیں جاؤں گا"۔ چنانچہ والد صاحب مفتی صاحب سے ملے۔ والد صاحب کے بیان کے مطابق مفتی صاحب فراست سے سمجھ گئے کہ یہ وہی ہیں جن کا تذکرہ کبھی کبھی راقم الحروف آپ سے کیا کرتا ہے۔

اِتَّقُوْا مِنْ فِرَاسَۃِ الْمُؤْمِنِ "مومن کی فراست سے ڈرو،
فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ۔ کیونکہ وہ اللہ کے نور کے ذریعہ
(حدیث پاک) اوکما قال۔ سے دیکھتا ہے۔"

والد صاحب فرماتے ہیں کہ مفتی صاحب کی یہ کرامت تھی کہ جو بات میرے دل میں آتی تھی، آپ اُسی کے متعلق گفتگو شروع کر دیتے تھے۔ والد صاحب جب واپس لوٹے تو کافی بدلے ہوئے تھے ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

جس دن مفتی صاحب واپس تشریف لیجانے والے تھے اُس سے ایک دو دن پہلے چند احباب نے بیعت کی درخواست کی (اور احقر نے بھی تجدید بیعت کی درخواست کی) آپ نے واپسی کے دن صبح کا وقت بعد نماز فجر دیا (اغلباً اتوار کا روز تھا) شومیٔ قسمت سے ایک دن پہلے احقر کو پسرور سے ایک دوست کا تار آگیا جس میں ایک نہایت ضروری کام کی وجہ سے وہاں پہنچنا لازمی تھا ورنہ اُس کی ملازمت کو سخت خطرہ تھا۔ طوعاً و کرہاً چار و ناچار مجھے پسرور جانا پڑا۔ دوسری صبح میرے احباب مثلاً قاضی محمد دین صاحب اورنٹیل ٹیچر، چوہدری غلام احمد صاحب انکم ٹیکس آفیسر، خان اورنگ زیب خاں صاحب بنگ کلرک وغیرہ بیعت ہو گئے۔ احقر اُسی شام واپس آیا تو قافلہ جا چکا تھا۔ اُسی کمرے کو جا کر پھر دیکھا۔ زبان سے نکلا۔

ع "ایں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

اُس رات احقر کا حال کیا رہا وہ نہ پوچھیے، غمگین، پریشان حال آنکھیں اشکبار سو رہا۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ رات کو پھر مفتی صاحب سے ملاقی ہوا اور حضرت نے پھر بیعت فرمایا۔ سامنے حضرت مولانا رحمہ بھی تشریف فرما نظر آئے۔ چنانچہ صبح صبح خوش و خرم اٹھا، اور غم و اندوہ کو بھلا دیا۔ اب جب تیسری بار تجدید بیعت کا ارادہ کروں گا تو خدا جانے کیا صورت پیش آئے۔ بقول مجذوب ع

"میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے"

مفتی صاحب کی ذات بابرکات کے متعلق احقر الانام کے ان سطور کے تحریر کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ حضرت حکیم الامت کے متوسل خاص کی شان اُجاگر ہو کر قارئین کرام کو حضرت والاؒ کے مدارج کا اندازہ لگانے میں مدد ملے۔ ورنہ حکیم الامت کس مرتبہ اور پایہ کے ولی اللہ تھے، اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو۔ احقر الانام تو کسی بزرگ کی جوتیاں سیدھی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ مفتی صاحب کا ذکر کرنے سے صرف مولانا تھانویؒ کا مرتبہ بتلانا مقصود تھا۔

ع "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

ورنہ میں کیا اور میری لکھنے کی بساط ہی کیا؟ حضرتؒ کے مریدین و مسترشدین میں بڑے بڑے پایہ کے لوگ گزر چکے ہیں، اور ماشاء اللہ اب بھی سلامت باکرامت ہیں۔ اُن میں سے کئی حضرتؒ کی سوانح نگاری کا حق ادا کر چکے ہیں، اور بعض حضرتؒ کی تعلیمات کی بہترین شرح و ترجمانی کر رہے ہیں ورنہ اپنے متعلق تو ؎

کہاں میں اور کہاں وہ نکہتِ گل!
نسیمِ صبح تیری مہربانی

آئندہ مضمون میں انشاء اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کی ذات بابرکات کے متعلق اور اُن کے سفر امرتسر و بہاولپور کے متعلق معلومات ہوں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ +

صحابۂ کرام پر ایک اجمالی نظر

"اصحابی کالنجوم بایّہم اقتدیتم اھتدیتم" (الحدیث)

(مولانا حامد الرحمٰن کاندھلوی ٹنڈو الہ یار سندھ)

دورِ جدید میں ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ نکھار کر اُن نمونوں کو دُنیا کے سامنے رکھا جائے، جو عرب کے معلّم اُمّی (فداہ ابی و امی) کے مخاطب اول، اور آپ کے اخلاق ومحاسن کے مظہر، نیز آپ کی تعلیم وتربیت کی مثال ہیں، اور جن کے بارے میں خود سرورِ کائنات کا ارشاد ہے:۔

اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم۔ (الحدیث)

"میرے اصحاب تاروں کی مانند ہیں جس کی روشنی میں چلوگے راہ یاب ہو جاؤ گے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اُس کی ابتداء وانتہا کے حیرت انگیز واقعات کی ایک عجیب وغریب مثال ہے۔ اوّل اوّل جب آپ نے دُنیا کو عقائد واعمال کے اصلاح کی دعوت دی، تو ریگستانِ عرب کے ایک ذرّہ نے بھی اس کا جواب نہ دیا، اور یہی کہتے رہے "اِنْ ھٰذا اِلّا سَاحِرٌ مُّبِیْنٌ" یاد آیا نضر ابن حارث نے قریش کو مخاطب بنا کر اس موقعہ پر کتنے بلیغ اور جامع فقرے کہے۔ جن کی تازگی آج بھی بعینہٖ محسوس ہو رہی ہے۔ کہا "جب محمدؐ تم میں نوخیز تھے (یعنی لڑکپن اور بے پروائی کا زمانہ تھا) توسب سے زیادہ اے قریش! تمہارے نزدیک پسندیدہ، سچے، اور امین، تھے۔ اور آج جب اُن کے بالوں میں سفیدی ظاہر ہوئی (یعنی حلم وتدبر کا وقت آیا) اور تمہارے پاس پیامِ ربانی لے کر آئے تو تمہارا خیال ہے کہ محمدؐ جادوگر ہیں۔ نہیں خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ساحر نہیں"

نضر کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔ قد کان محمدٌ فیکم غلاماً حدثاً ارضاکم فیکم، واصدقکم حدیثاً، واعظمکم امانۃً حتی اذا رأیتم فی صدغیہ الشیب وجائکم بما قلتم ساحر، لا واللہ ما ھو بساحرٍ۔ (محاضرات ج۱ ص۱۵۳)

لیکن صداقت کے اثر اور تربیت پذیری کے جوہر نے چند ہی روز میں آپ کے آگے، پیچھے، داہنے، بائیں، غرض ہر طرف اُن جان نثاروں کی قطاریں کھڑی کر دیں جن کے وجود سے تمام انبیاء، اور دُنیا کے رہنماؤں کی سیرتیں یکسر خالی ہیں، اور جن کا اُسوۂ حسنہ رہتی دُنیا تک تمام انسانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

بخاری میں ہے کہ غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضرت مقداد انصاری رضؓ نے کہا "یارسول اللہ! ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خُدا جاکر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے لڑیں گے۔"

اس تقریر سے رسول اللہ کا چہرۂ انور چمک اُٹھا۔

آج مسلسل تیرہ سو برس گزرنے پر بھی یہ تارے اُسی آب وتاب کے ساتھ چمک رہے ہیں، اور گم گشتگانِ راہ انہی ستاروں کی روشنی میں اپنی منزلِ مقصود کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ اصحابِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک خط وخال کو ہم تاریخ کے مرقع میں دیکھ سکتے ہیں اور اُن کے تمام مذہبی، علمی، سیاسی، اخلاقی، فضائل کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے، اور ہم اس تاریخ کو ہر حیثیت سے

دُنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

علمائے اسلام کو سیر الصحابہ کی تدوین و ترتیب کا خیال اس بنا پر پیدا ہوا کہ روایات میں سب سے پہلے صحابۂ کرام ہی کا نام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اول اول محدثین نے اس کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ صحابۂ کرام کے حالات میں سب سے پہلی کتاب امام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ نے تصنیف کی جس کا نام اسماء الصحابہ تھا اور جس کا اکثر حصہ علامہ ابوالقاسم نے اپنی کتاب معجم الصحابہ میں نقل کیا ہے۔ اس کے بعد اس فن کو بہت ترقی ہوئی۔ اور بکثرت علماء مثلاً ابوبکر ابن داؤد، عبدان مطین، ابوعلی ابن السکن ابوحفص ابن شاہین وغیرہ نے اس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں لیکن اُن میں ابوعبداللہ المندہ ۳۹۵ھ اور قاضی ابن عبدالبرؒ کی کتابیں مقبول ہوئیں۔ اور انہی کو متاخرین نے اپنی تصانیف کا ماخذ قرار دیا۔ پھر ان پر بھی بہت سے علماء نے ذیل لکھے۔

اِس کے بعد علامہ ابن الاثیر جزریؒ المتوفی ۶۳۰ھ نے صحابہؓ کے حالات میں ایک نہایت مبسوط کتاب لکھی جس کا نام اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ہے۔ اس کا ماخذ بھی ابن عبدالبر اور ابن مندہ کی کتابیں ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی پانچ جلدوں میں ایک مفصل کتاب لکھی جس کا نام اصابہ فی تمیز الصحابہ' ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے اس کا ایک خلاصہ لکھا جس کا نام عین الاصابہ' ہے۔ بہرحال صحابہ کے حالات میں جو کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں وہ صرف یہی استیعاب۔ اسد الغابہ۔ اصابہ' اور تجرید اسماء الصحابہ ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بہت سی کتابوں سے متفرق طور پر صحابۂ کرام کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

صحابی کسے کہتے ہیں؟ علماء کی آراء اس بارے میں مختلف ہیں محدثین اور جمہور اصولیین نے صحابی ہونے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ اُس کو ایک مدت تک حضور اکرم کے ساتھ نشست و برخاست کا موقعہ ملا ہو۔ حضرت سعید ابن مسیبؓ نے اِس شرط کے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے کہ کم از کم اُس کو حضورؐ کے ساتھ دو ایک غزوات میں شرکت کا موقعہ بھی ملا ہو۔ ایسے ہی بعض حضرات کے نزدیک صحابی وہ ہے جس نے آپ سے روایت حدیث کی ہو۔ بعض کے نزدیک رؤیت بھی ضروری نہیں بعض کے نزدیک، ہر اُس مسلمان کو صحابی کہتے ہیں جس نے حالت بلوغ اور حالت صحت عقل میں آپ کو دیکھا ہے۔ لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ صحابی ہر وہ شخص ہے جس نے بحالتِ اسلام آپ کو دیکھا یا مُلاقات کی ہے۔

تعدادِ صحابہ:۔ جہاں تک تعداد صحابہ کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں کوئی حتمی اور فیصلہ کُن بات نہیں کہی جا سکتی۔ کیوں کہ صحابہ کے مشاغل دینیہ نے خود صحابہ کو اس طرف متوجہ ہونے نہیں دیا۔ اِس کے علاوہ اکثر مسلمان بدوی تھے جو صحراؤں میں رہتے تھے جن کے تحقیق حال کا اُس زمانہ میں کوئی ذریعہ نہ تھا۔

بہرحال وسط تعدادِ صحابہ ایک لاکھ کے قریب کہی جا سکتی ہے البتہ اکابر صحابہ کے نام اُن کی تعداد اور اُن کے حالات بسط کے ساتھ موجود ہیں۔ مختلف حیثیتوں سے صحابۂ کرام کے مختلف طبقات ہیں۔ فضائل و مناقب کے لحاظ سے اہلسنۃ والجماعۃ کے نزدیک بالاتفاق خلفائے راشدین حسب ترتیب تمام صحابہ سے افضل ہیں۔ خلفاء کے بعد ازواج مطہرات، پھر مہاجرین اولین، پھر اہل عقبہ پھر اہل بدر، پھر اہل مشاہد۔

صحابۂ کرام کا مبارک زمانہ پہلی صدی ہجری سے شروع ہو کر دوسری صدی کے ابتدائی حصے میں ختم ہو گیا۔ حضرت سہلؓ ابن ابن سعد ابن مالکؓ آخری صحابی ہیں جنہوں نے باختلاف روایت ۸۸ھ یا ۹۱ھ میں، ۹۶ یا سو برس کی عمر میں وفات پائی۔ خود حضرت سہلؓ فرمایا کرتے تھے کہ " میں مرجاؤں تو تم کو رسول اللہ سے روایت کرنے والا نہ ملے گا" حضرت انسؓ ابن مالکؓ آخری صحابی تھے جو بصرہ میں رہ گئے تھے۔ خود اُن سے ایک شخص نے پوچھا کہ " اب کوئی صحابی باقی ہے یا نہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا کہ " دیہات کے چند اعرابی البتہ باقی ہیں، جنہوں نے رسول اللہ کی زیارت کی ہے، لیکن اب کوئی ایسا شخص نہیں جس نے آپ کی صحبت اُٹھائی ہو" آپ نے بھی باختلاف روایت ۹۱ھ ۹۳ھ

یا ۱۱۰ھ میں سو برس کی عمر میں وفات پائی۔ اُن کے بعد حضرت ابو الطفیلؓ عامر ابن واثلہ۔ ایک صحابی رہ گئے تھے جنہوں نے سنہ ۱۱۰ھ میں مکہ میں وفات پائی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ "آج میرے سوا روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں جس نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہو" بہر حال عام روایات کی بناء پر پہلی صدی کے ختم ہونے کے ساتھ صحابۂ کرام کا مبارک دور بھی ختم ہو گیا۔ اور وہ نورانی صورتیں دُنیا کی آنکھوں سے چھُپ گئیں جنہوں نے ایک صدی تک دُنیا کو بقعۂ نور بنائے رکھا تھا۔ اب صرف اُن کے اعمال صالحہ رہ گئے ہیں جن کو ہم اپنے لئے مشعلِ راہ بنا سکتے ہیں۔ ذیل میں صحابۂ کرام کی زندگی کے چند متفرق خاکے پیش کئے جاتے ہیں:۔

رقّتِ قلب اور اثر پذیری ایک نیک سرشت انسان کا اصلی جوہر ہیں اور سنگدلی و قساوت ایک بدبخت اور شقی انسان کا سرمایۂ حیات، بہت سے ہیں جنہوں نے ہزارہا کوششوں کے باوجود خدائے لایزال کے آگے سر نہیں جھکایا۔ لیکن برخلاف اس کے صحابہ کرام قرآنِ کریم کے اثر، سرورِ کائنات کے اخلاق و عادات اور شمائل کو دیکھ کر ہی برضا و رغبت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ ابوذرؓ۔ طفیل ابن عمرو دوسی، خالد العدوانیؓ سب قرآن کریم کے اثر سے ہی اسلام میں داخل ہوئے۔ (اصابہ۔ مسلم۔ بخاری مسند ابن حنبل)

حضور اکرم مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے یہ تعلیم دی۔ "سلام کو رواج دو، کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو، اور ان کے صلہ میں جنت لو" حضرت عبداللہ ابن سلام نے اس کے اثر سے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ اور کہا کہ "آپ ایک حق مذہب لیکر آئے ہیں" (بخاری باب ہجرۃ النبیؐ) بعض نے صرف آپکی شکل و صورت دیکھتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ اور پکار اوٹھے:۔ "جھوٹے آدمی کا چہرہ ایسا نہیں ہو سکتا"

اپنے مقصد اور نصب العین پر پختگی صحابہ کرام میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ کسی مقصد کو اپنانے کے بعد لالچ، یا طمع کی بناء پر اُس سے پھر جانا، اخلاقی گراوٹ ہے۔ صحابہ کو بھی ابتداء اسلام میں اس سے واسطہ پڑا۔ لیکن حضرات صحابہ اس امتحان میں بھی پورے اُترے۔ خود صحابہ پر فقر و تنگ دستی غالب تھی۔ لیکن اُن کے مخالفین یہود و مشرکین دولت و ثروت سے مالا مال تھے۔ مگر اُن کی چھنکتی ہوئی تجوریاں صحابہ کے پائے ثبات کو اسلام و ایمان کی متاعِ بے بہا سے لغزش نہ دلا سکیں۔ حتیٰ کہ مصائب سے نجات ملنے کی پیش کش کو صحابۂ کرام نے اس کمال بے پروائی کے ساتھ ٹھکرا دیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جب غزوۂ تبوک کی عدم شرکت کی بناء پر حضور اکرمؐ حضرت کعب ابن مالکؓ سے ناراض ہو گئے۔ تو آپ کے حکم سے تمام صحابہ نے اُن سے تعلقات منقطع کر لئے۔ تو شاہ غسان نے اُن کو لکھا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے آقا نے تم پر ظلم کیا ہے خدا تم کو ذلت اور کس مپرسی کی زمین میں نہ رہنے دیگا آؤ ہم سے مل جاؤ، ہم تمہاری غمخواری کرینگے" لیکن انہوں نے اُس خط کو تنور میں ڈال دیا۔ (بخاری کتاب المغازی)

ضعیف القلب انسان مصائب کے تصور سے بھی کانپ اُٹھتا ہے لیکن صحابہ کرام نے اسلام کے لئے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیں اور اُن کے ایمان میں ذرہ برابر تزلزل واقع نہیں ہوا۔

حضرت زبیر ابن عوامؓ جب اسلام لائے تو اُن کے چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر دھواں دیتے تھے، حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی سعید ابن زید اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے اُن کو رسیوں میں باندھ دیا۔ (بخاری)

ہجرت صحابہ کرام نے اسلام کے لئے جو مصائب برداشت کئے اُن میں ہجرت کی داستان نہایت درد انگیز ہے۔ خود حدیث میں آیا ہے:۔

ان شان الھجرۃ شدید "ہجرت کا معاملہ نہایت سخت ہے"

جو لوگ ہمیشہ مصائب برداشت کرنے کے خوگر تھے وہ بھی اس مُصیبت کو برداشت نہ کر سکے۔ ایک بدو مدینہ میں ہجرت کر کے آیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ سوءِ اتفاق سے اِسلام لانے کے بعد اُس کو بُخار آگیا اُس نے اِسکو

اسلام کے شگونِ بد کا نتیجہ سمجھا اور اصرار کے ساتھ بیعت فسخ کرالی اس موقعہ پر آپ نے فرمایا "مدینہ سُنار کی بھٹی کے مثل ہے میل کچیل کو باہر پھینک دیتا ہے اور خالص سونے کو الگ کر دیتا ہے" یہ زرِ خالص صحابہ ہی تھے جو مدتوں مدینہ میں نعل در آتش رہے۔

لیکن اسلام کے لئے اِن تمام سختیوں کو گوارا کیا۔ صحابۂ کرام ہجرت کر کے مدینہ آئے تو مدینہ کی آب و ہوا راس نہ آئی اور متعدد بزرگ بُخار میں مبتلا ہو گئے۔ اِس حالت میں حضرت ابوبکرؓ یہ شعر پڑھتے تھے ؎

کل امرئ مصبح فی اھلہ
والموت ادنی من شراک نعلہ

حضرت بلالؓ مکہ کی وادیوں، چشموں، اور پہاڑیوں کو یاد کر کے چیخ اُٹھتے تھے اور اپنے رنج و غم کا اظہار اِن حسرتناک اشعار میں کیا کرتے تھے:- (ترجمہ)

"کاش! میں ایک رات اُس میدان میں بسر کرتا جس میں میرے گرد اذخر و جلیل ہوتے (مکہ کی دو قسم کی گھانسوں کا نام ہے) کیا میں پھر کسی دن مجنہ کے پانی سے سیراب ہوں گا؟ کیا میرے سامنے پھر شامہ و طفیل (پہاڑیاں) ہوں گی؟"۔

مسکین نوازی

صحابۂ کرام نہایت مسکین نواز اور غریب پرور تھے۔ حضرت جعفر ابن ابی طالبؓ، کو مساکین کے ساتھ خاص انس تھا اور اُن کے پاس اکثر بیٹھتے تھے اور اُن سے باتیں کرتے تھے۔ اِس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو ابوالمساکین، کی کُنیت سے پکارتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں تمام صحابہ سے قرآن مجید کی وہ آیتیں پوچھا کرتا تھا جو مجھے اچھی طرح معلوم تھیں، اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی کھانا کھلائے۔ جب حضرت جعفر ابن ابی طالبؓ سے پوچھنے کا اتفاق ہوتا، تو وہ پہلے گھر لے جا کر کھانا کھلاتے، پھر جواب دیتے اگر گھر میں کچھ نہ ہوتا تو خالی گھی کا کُپّہ اُٹھا لاتے اور اُس کو پھاڑ ڈالتے، اور ہم لوگ اُس کو چاٹ لیتے۔ (ترمذی و بخاری)

صحابۂ کرام اگرچہ مفلس اور نادار تھے لیکن کسی کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلاتے تھے۔ ایک بار چند صحابی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی شرائطِ بیعت میں ایک شرط یہ بھی تھی:-

لا تسألوا الناس شیئاً۔ "لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرنا"۔

ان لوگوں نے اس شدّت کے ساتھ اس کی پابندی کی کہ اگر راہ میں کوڑا بھی گر جاتا تھا تو کسی سے یہ نہیں کہتے تھے کہ اُٹھا کر دے دو۔ (ابوداؤد باب کراہیۃ المسئلۃ)

اگر کسی وقت بدرجۂ مجبوری سوال کا موقعہ بھی آتا تو صحابۂ کرام شرم سے علانیہ طلب نہیں کرتے تھے بلکہ حسنِ طلب سے کام لیتے تھے۔

صحابۂ کرام جس طرح نوعِ انسان میں فردِ کامل کا درجہ رکھتے تھے اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو اُن اوصاف کے ساتھ متصف کیا تھا جو محاسنِ اخلاق کے تمام اصناف و انواع میں کمال کا درجہ رکھتے ہیں۔ فیاضی ایک اخلاقی وصف ہے لیکن ایثار فیاضی کی اعلیٰ ترین قسم ہے، اور وہ صحابۂ کرام میں عموماً پائی جاتی تھی۔

ایک بار رسول اللہ نے حضرت عمرؓ کو عطیہ دینا چاہا۔ لیکن اُنہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "یہ اُس کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو" (بخاری کتاب الزکوٰۃ) اگرچہ صحابۂ کرام کے تمام اخلاقی محاسن نے اسلام کو تقویت دی۔ لیکن سب سے زیادہ اسلام کو صحابہ کی فیاضی سے رسوخ و ثبات حاصل ہوا۔ مدینہ رسول اللہ کیلئے غربت کدہ تھا لیکن انصار کی فیاضی نے آپ کو اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ مہاجرین کو اپنے گھروں میں ٹھیرایا، اور اُن کو اپنے مال و دولت کا شریک و سہیم بنا دیا۔ چنانچہ جب مہاجرین مدینہ آئے تو انصار نے اپنی تمام زمینیں اور باغات اُن کو اِس شرط پر دیدیے کہ یہ لوگ کمائیں اور سال میں نصف پیداوار تقسیم کر لیا کریں۔

حضرت سعد ابن الربیعؓ نے جائیداد کے ساتھ حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کو اپنی ایک بی بی دینا چاہی لیکن اُنہوں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ (بخاری)

یہ حالت غزوۂ خیبر یعنی ۷ھ تک قائم رہی۔ لیکن جب خیبر

نسخ ہوا، تو مہاجرین نے انصار کے باغ واپس کر دیئے۔

حضرت قیس ابن عبادہ انصاریؓ اس قدر فیاض تھے کہ اُن کے پاس ایک پیالہ تھا، وہ جہاں جاتے تھے اُس میں ایک آدمی گوشت اور مالیدہ بھر کے لیکے چلتا تھا اور پکارتا جاتا تھا کہ "ھلموا الی اللحم والثرید" یعنی "آؤ اور گوشت اور مالیدہ کھاؤ"۔ ایکبار ایک بڑھیا نے اُن سے کہا کہ "میرے گھر میں چوہے نہیں رہتے"۔ بولے کیا خوب کنایہ ہے اس کا گھر روٹی، گوشت، گھی اور کھجور سے بھردو

(حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۹۵) (کف لسان)

حدیث میں آیا ہے:- "جس شخص کو خدا نے دو چیزوں کی برائیوں سے محفوظ رکھا وہ جنت میں داخل ہوا یعنی زبان اور شرمگاہ" (موطا مالک) اِس لئے صحابہ کرام غیبت، بدگوئی، نکتہ چینی، فحاشی، سب وشتم، اور لایعنی باتوں سے نہایت احتراز کرتے تھے۔

ایک شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے ہم اُس کو افسانہ بنا لیتے ہیں لیکن صحابہ کرام عیب پوشی فرمایا کرتے تھے۔

صبر وثبات

مُردوں پر نوحہ وبکا کرنا، بال نوچنا، کپڑے پھاڑ ڈالنا، مدتوں مرثیہ خوانی کرنا عرب کا قومی شعار تھا۔ لیکن فیض تربیت نبویؐ نے صحابہ کرام کو صبر کا اس قدر خوگر بنا دیا تھا کہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کا لڑکا بیمار ہوا، اور وہ صبح کے وقت اُس کو بیمار چھوڑ کر کام کاج کے لئے باہر چلے گئے اور اُن کی عدم موجودگی میں لڑکا جان بحق تسلیم ہو گیا۔ اُن کی بیوی نے لوگوں سے کہدیا تھا کہ ابوطلحہؓ سے نہ کہنا۔ شام کو وہ پلٹے، تو بیوی سے پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ بولیں "پہلے سے زیادہ سکون کی حالت میں ہے" یہ کہکر سامنے کھانا لائیں، اور اُنہوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد معمول سے زیادہ بن ٹھن کے آئیں اور اُن کے ساتھ ہمبستر ہوئیں۔ صبح ہوئی تو استعارۃً کہا" اگر ایک قوم کسی کو کوئی چیز عاریتہً دے اور پھر اُس کا مطالبہ کرے تو کیا اُسکو روک رکھنے کا حق حاصل ہے؟" بولے "نہیں" بولیں "تو پھر اپنے بیٹے کو صبر کرلو"۔ (مسلم و بخاری)

نبی کریم ﷺ غزوۂ احد سے واپس ہوئے تو تمام صحابیات اپنے اپنے اعزّا و اقارب کا حال پوچھنے آئیں، اُن ہی میں حضرت حمنہ بنت جحشؓ بھی تھیں وہ آئیں تو آپ نے فرمایا کہ "حمنہ اپنے بھائی عبداللہ بن جحش کو صبر کرو"۔ اُنہوں نے انا للہ الخ پڑھا اور اُنہوں نے دعائے مغفرت کی۔ پھر آپ نے فرمایا۔ "اپنے ماموں حمزہؓ ابن عبدالمطلب کو بھی صبر کرو" اُنہوں نے اِس پر بھی انا للہ الخ پڑھا اور دعائے مغفرت کر کے خاموش ہو رہیں۔ (ابن سعد)

حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ جب حجاج سے معرکہ آرا ہوئے تو اُن کی والدہ حضرت اسماءؓ بیمار تھیں وہ اُن کے پاس آئے اور مزاج پرسی کے بعد بولے کہ "مرنے میں آرام ہے"۔ بولیں "شاید تم کو میرے مرنے کی آرزو ہے۔ لیکن جب تک دو باتوں میں سے ایک نہ ہو جائے میں مرنا پسند نہ کروں گی۔ یا تو تم شہید ہو جاؤ اور میں تم کو صبر کرلوں، یا فتح و کامرانی حاصل کرو کہ میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں" چنانچہ جب وہ شہید ہو چکے تو حجاج نے اُن کو سولی پر لٹکا دیا۔ حضرت اسماءؓ باوجود پیرانہ سالی کے اس عبرت گاہ میں آئیں اور بجائے اس کے کہ روتی پیٹتیں حجاج کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا اِس سوار کے لئے ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ اپنے گھوڑے سے نیچے اُتر آئے؟" (استیعاب)

اِسی صبر وثبات کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کفار نے حضرت خبیبؓ کو شہید کرنا چاہا تو اُنہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی اور کہا کہ "اگر تم کو یہ خیال نہ ہوتا کہ میں مرنے سے ڈرتا ہوں تو ان رکعات کو اور طویل کرتا"۔ اس کے بعد یہ اشعار پڑھے ؎

ولست ابالی حین اقتل مسلما
علی ای شق کان للہ مصرعی
وذلک فی ذات الالہ وان یشاء
یبارک علی اوصال شلو ممزع (بخاری)

جبکہ میں مسلمان ہو کر مرتا ہوں تو اس کی کیا پروا کہ میرا دھڑ کس بل گریگا، یہ مرنا تو خدا کے لئے ہے، اگر وہ چاہے تو ان کٹے ہوئے جوڑوں پر برکت نازل کر سکتا ہے۔"

خاکساری

اگرچہ دنیا صحابۂ کرام کی خاک پا کو آنکھ کا سُرمہ بناتی ہی لیکن باینہمہ وہ نہایت فروتن، متواضع اور خاکسار تھے۔ ایک بار محمد ابن حنفیہؓ نے حضرت علی کرم اللہ سے پوچھا کہ "رسول اللہ کے بعد کون شخص افضل الناس ہے؟" فرمایا "ابوبکرؓ"۔ پھر پوچھا کہ "اُن کے بعد؟" بولے "عمرؓ"۔ اس کے وہ خود کہہ اُٹھے کہ "اُن کے بعد" "آپ"۔ فرمایا "میں تو مسلمانوں کا ایک معمولی فرد ہوں"۔ (ابوداؤد)

حضرت سلمان فارسیؓ مدائن کے گورنر تھے لیکن طرزِ معاشرت اِس قدر سادہ تھا کہ کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ کو جاہ پسند کہا جاتا ہے لیکن ایک بار ابن عامر اُن کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے تو انہوں نے منع فرمایا۔ (طحاوی)

شکرِ الٰہی

ایک انسان کا بیٹا مرجاتا ہے، دولت لُٹ جاتی ہے، جائداد تباہ ہوجاتی ہے تو وہ ابتداً میں بدحواس ہوجاتا ہے۔ لیکن مایوسی مجبوراً صبر کا خوگر بنا دیتی ہے کہ "الیاس احدی الراحتین"۔ لیکن جب خدا ایک لاولد شخص کو بیٹا دیتا ہے، ایک مفلس کو دولت مل جاتی ہے، ایک ذلیل شخص معزز ہوجاتا ہے تو وہ دفعۃً اس قدر مغرور اور خود پسند ہوجاتا ہے کہ اس حالت میں اُس کو خدا یاد نہیں آتا۔ بعض صوفیہ کا قول ہے کہ صبر آسان اور شکر مشکل ہے۔ لیکن اسلام کے تمام دور صحابۂ کرام کے سامنے تھے وہ بھی جس میں سخت مفلس و محتاج اور ذلیل تھے، وہ بھی جس میں دولت مند، متمول، اور معزز ہوگئے تھے۔ پہلے دور میں انہوں نے صبر کیا تھا اور دوسرے دور میں خدا کا شکر بجالاتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ "میں نے یتیمی میں نشو ونما پائی، مسکینی کی حالت میں ہجرت کی، کھانے پر ابنۂ غزوان کا ملازم تھا جب وہ لوگ منزل پر اُترتے تھے تو اُن کے لئے لکڑیاں چُن لاتا تھا، اور جب وہ اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو اُن کی حدی خوانی کرتا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب دین نے قوت حاصل کرلی ہے اور ابوہریرہؓ "امام" بن گیا ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

زندہ دلی

اسلام نے صحابۂ کرام کے جذبات کو تروتازہ شگفتہ اور زندہ کردیا تھا اِس لئے اُن میں زندہ دلی پائی جاتی تھی، اور وہ مختلف طریقوں سے اُس کا اظہار کرتے تھے۔ تمام صحابہ عید کے دن خوشیاں مناتے تھے، دعوتیں کرتے تھے اور ہمسایوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ قربانی نماز کے بعد کی جاتی ہے۔ لیکن ایک صحابی نے نماز سے پہلے ہی قربانی کردی، اور آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ کھانے پینے کا دن تھا اِس لئے جلدی کی، خود کھایا، بچوں اور ہمسایوں کو کھلایا۔ (ابوداؤد کتاب الضحایا)

عید کے دن معمولاً چھوکرے اور چھوکریاں رسول اللہ کے پاس جمع ہوکر دف بجاتے اور مسرت کے ترانے گاتے تھے۔ رسول اللہ کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک مصلے پر بیٹھے رہتے تھے، اس حالت میں صحابۂ کرام زمانۂ جاہلیت کے واقعات کا ذکر کرتے تھے، اشعار پڑھتے تھے اور ہنستے تھے، آپ ان تذکروں کو سنکر مُسکراتے تھے۔ (بخاری)

کبھی کبھی یہ زندہ دلی سنجیدہ ظرافت کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے؟" بولا "جمرہ" (چنگاری)، پوچھا "باپ کا نام؟" کہا "شہاب" (شعلہ)، پوچھا "کس قبیلہ سے ہو؟" بولا "حرقہ" (جلن)، پوچھا "مکان کس جگہ ہے؟" بولا "حرۃ النار" (آگ کی سرزمین) پوچھا "وہ کس جگہ ہے؟" بولا "ذات النظی" (شعلہ والی زمین) فرمایا "گھر والوں کی تو خبر لے وہ جل بھُنے"۔ اُس نے جاکر دیکھا تو واقعی ایسا ہی معاملہ تھا۔ (موطا مالک، باب ما یکرہ من الاسماء)

غزوۂ تبوک کے زمانہ میں نبی کریمؐ ایک نہایت تنگ اور چھوٹے خیمے میں مقیم تھے ایک صحابی آئے اور سلام کیا آپنے جواب سلام کے بعد فرمایا "اندر جاؤ" بولے "اپنے پورے جسم کے ساتھ یا رسول اللہ؟" یعنی انہیں بہ نظر لطافہ تعریض تھی کہ خیمہ اسقدر تنگ ہے کہ پورا جسم بہ مشکل اُس کے اندر آسکتا ہے۔ لیکن مذہبی مذاریوں کے وقت صحابۂ کرام سے یہ سب چیزیں فراموش ہوجاتی تھیں اور صحابۂ کرام اسکی ذمہ داریوں کی گرانباری سے بدحواس ہوجاتے تھے۔ صحابۂ کرام کی زندگی کے یہ مختلف نمونے ہیں۔ کیا ہماری زندگیوں میں بھی اسکی جھلک نظر آتی ہے؟ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صحابہ کی طرزِ زندگی پر چلنے کی ہم کو توفیق عطا فرمائے + (اللہم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ)

قسط ۲۶:-

احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن

(مولٰنا سیّد مناظر احسن گیلانی)

(سلسلہ کیلئے دیکھئے رسالہ دار العلوم بابت ماہ جنوری ۱۹۵۴ء)

بظاہر یہ برساتی نالے تھے۔ برسات ہی کے موسم میں شاید جاری ہوجاتے ہیں، اور دنوں میں خشک رہتے ہیں۔ الغرض نالے سے ہم پار ہوئے اور ان ہی پیر مرد کی راہ نمائی میں آگے بڑھتے رہے غالباً اس نالے کے بعد جس کے کنارے "خوانِ نعمت" چُنا گیا تھا پھر کوئی نالہ پگڈنڈی کی حد تک تو نہ ملا۔ کچھ ہی دیر بعد اچانک ہم اسی جنگل کے ایک ایسے حصّہ میں پہونچ گئے جو درختوں سے نسبتاً خالی تھا۔ اور دور دور تک سفید سفید کچھ عمارتوں کے آثار اسی جنگل میں جھلکنے لگے، پیر مرد ٹھٹھک گئے، اور مجھے روک کر بولے، لو میاں! یہی تمہارا گروکل کانگڑی ہے، سامنے ہی۔ اب آگے راہ نمائی کی ضرورت نہیں، میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ محبت و انس میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے انہوں نے مجھے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے اللہ کے سپرد تم کو کیا، وہ سلام کر کے روانہ ہوگئے۔ عمارتوں کا یہ سلسلہ کچھ زیادہ دور نہ تھا، چند ہی منٹ میں اپنے آپ کو میں نے اس مقام پر پہونچا دیا، جہاں کافی چہل پہل اور آدمیوں کا آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، چھوٹے بڑے مکانوں کا دُور تک اِدھر اُدھر سلسلہ پھیلا ہوا تھا، زمین کا ایک قطعہ تھا جس کا طول بظاہر چند میل سے بظاہر زیادہ تھا۔ لیکن عرض کچھ زیادہ نہ تھا ایک طرف گنگا کا وہی بڑا نالہ تھا جس سے کشتی پر ہردوار میں ہم پار ہوگئے تھے اور دوسری طرف معمولی نالہ اس وقت اس علاقہ کا جغرافیہ کچھ اسی شکل میں دماغ کے اندر آیا تھا۔ عمارتوں کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے دوسری طرف کے چھوٹے نالے سے گذرنا پڑا تھا، اس نالہ میں بھی اور اس سے پہلے چھوٹے چھوٹے نالے بس اسی قدر تھے کہ گھٹنوں سے زیادہ پانی کسی میں نہ تھا ممکن ہے کسی میں کچھ پانی زیادہ ہو لیکن اگر گول گول، کائی زدہ پتھروں کا سلسلہ پاؤں کے نیچے نہ آجاتا تو شاید ان نالوں کو حافظہ یاد بھی نہیں رکھتا۔ ساغر تو خیر میرے ہاتھ میں نہ تھا۔ لیکن رُڑکی کے بزرگ کا دیا ہوا تام لوٹ، اور ان ہی کا بخشیدہ بھرتے کا پیالہ جو کپڑوں میں بندھا تھا، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہوں کہ "گٹھری کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

تو یہ واقعہ ہے کہ قدم قدم پر بھی "چلا میں" کی صورت پیش آتی تھی۔ خیر جنگل کی پگ ڈنڈی بھی ختم ہوگئی، اب سامنے کھلا میدان تھا، درخت تو اس میں بھی تھے۔ لیکن غالباً کاٹ دیئے گئے تھے، اور ان ہی کو کاٹ کاٹ کر سبج سبج جن مکانوں کے لئے جگہ نکالی گئی تھی جس وقت گروکل کی اس آبادی کی طرف روانہ ہوا، تو مڑ مڑ کر اچانک راستہ میں ملجانے والے اُس پیر مرد راہ نما کو دیکھتا جاتا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے۔ آخر یہ صاحب کون تھے؟ اس جنگل میں کہاں سے آگئے، کیوں آگئے۔ لیکن آخری فیصلہ دل نے یہی کیا، کہ شاید اسی طرف کے رہنے والے کوئی صاحب ہیں، جو ہردوار جاتے تھے، اتفاقاً راستہ میں میری اُن سے مُلاقات ہوگئی۔ مگر میرا یہ ذاتی نظریہ ہے، جس کی صحت اس پر موقوف ہے کہ ان جنگلی آبادیوں میں بھی پتہ ہے، کہیں کہیں مسلمان بھی رہتے ہیں، یا اس زمانہ میں رہتے تھے، غالباً ان ہی پیر[1] مرد بزرگ سے معلوم ہوا تھا کہ "کانگڑی" نامی

---

[1] مجھے کیا مضمون کے عام پڑھنے والوں کا ذہن بھی ممکن ہے ادھر جائے کہ شاید یہ کوئی روحانی ہستی ہوں، لیکن قرینہ و قیاس سے اس خیال کی توثیق پر کم از کم میرا دل آمادہ نہیں ہوتا، اپنی کوتاہ نصیبیوں کو خیال کرتے ہوئے، سچ تو یہ ہے کہ شاید اس کا وہم بھی نہ ہونا چاہئے۔ ۱۲۔

کو کی گانوں، اسی جنگلی علاقہ میں ہے، جس میں زیادہ تر اہیر یا مویشیوں کے چرانے والے گوالے وغیرہ رہتے ہیں، چونکہ گرد کل کے لئے زمین کا انتخاب اِسی جنگلی گانوں کے آس پاس کیا گیا تھا، اِس لئے کانگڑی کی طرف یہ گرد کل منسوب ہو گیا۔ ایسا خیال آتا ہے کہ "کانگڑی" گانوں کی طرف اُنگلیوں سے اشارہ کر کے مجھے اُنہوں نے بتایا بھی تھا کہ یہی کانگڑی ہے، جنگلی گانوؤں میں جیسے مکانات ہوتے ہیں غالباً دُور سے وہی نظر بھی آئے تھے۔ لیکن یادداشت میں اس کے ارتسامات تقریباً مٹ مٹا سے گئے ہیں۔ اس قصہ کو تو چھوڑئیے۔

اب آئیے میں گرد کل کے احاطہ میں پہونچ گیا، برسوں کی پالی پوسی ہوئی آرزو آج پوری ہوئی تھی۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی، لوگ آجارہے تھے۔ اُن ہی میں سے کوئی میری طرف بھی متوجہ ہوا، کون ہو؟ کہاں سے آرہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ جواب سب کا دے دیا گیا، اور خواہش ظاہر کی کہ گرد کل کے "مہا گرو" یا پرنسپل صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کوئی نیک دل آدمی تھا، پردیسی کی امداد کو اپنا انسانی فرض خیال کر کے اپنے ساتھ مختلف عمارتوں، اور احاطوں سے گذارتے ہوئے جن کے کمروں میں نظر آیا کہ اساتذہ درس دے رہے ہیں، طلبہ پڑھ رہے ہیں۔ میں ایک اچھے خاصے کمرے کے سامنے لاکر ٹھیرا دیا گیا۔ اور اندر سے آنے کی اجازت حاصل کر کے وہی صاحب مجھے اندر لے گئے، اندر داخل ہوا، ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو دیکھا کہ مجھے دیکھکر کُرسی سے اُٹھ گئے، اور کشادہ پیشانی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنے سامنے کی کُرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ یہی گرد کل کے "مہا گرو" یا "صدر مدرس" گورنر یا پرنسپل کے نام سے مشہور تھے۔ اخباروں میں گرد کل کے گورنر یا پرنسپل صاحب کا نام جس سے ہم کافی آشنا تھے، منشی[1] رام تھا، خیال یہی تھا کہ میں منشی رام جی سے مل رہا ہوں۔ لیکن بہت جلد مجھ پر واضح ہوا کہ یہ منشی رام جی گرد کل کے مشہور بانی اور گورنر نہیں ہیں، بلکہ کوئی اور صاحب ہیں۔

جہانتک یاد رہ گیا ہے، اپنا نام اُنہوں نے "رام دیال" بتایا تھا، بعد کو بھی یہی نام گرد کل کے سلسلہ میں کان میں پڑتا رہا، شاید یہ ایم اے پاس تھے۔ حالانکہ فقیر لنگی باندھے ایک عامی بلکہ دہقانی مسلمان کی شکل میں اُن کے سامنے پیش ہوا تھا، اور اپنی مولویت کو "پیرانِ دانا" کی ہدایت کے مطابق کھُلنے نہ دیا، مگر مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ جس کی توقع نہیں کی جاسکتی، گرمجوشی کے اُن ہی جذبات کے ساتھ گرد کل کے یہ پرنسپل صاحب مجھ سے ملے، چند طلبہ جو اُن کے پاس بیٹھے ہوئے غالباً کچھ پڑھ رہے تھے، اُن کو اُٹھا دیا گیا۔ اور کمرے میں تنہا میرے ساتھ بیٹھ کر رسمی گفتگو کے بعد خاص مسئلہ تعلیم پر وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے باتیں کریں، لیکن اپنی عامیت کو ظاہر کرنے کے لئے اُن سے کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتا رہا، تاہم پھر بھی اُنہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگوں کے یاں ایک تو دیوبند کا مدرسہ ہے، اور ایک ندوہ کا، ہمارے گرد کل کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو خیال کر لیجئے کہ یہ ندوہ کے اُصول پر قایم کیا گیا ہے۔ یعنی قدیم علوم و فنون سنسکرت کی زبان میں ہمارے یاں جو ہیں اُن کا رشتہ جدید علوم و فنون کے ساتھ جوڑنے کی کوشش اس میں کی گئی ہے، ایسا خیال آتا ہے کہ اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ شہری تمدن کے زہریلے جراثیم سے طلبہ کو محفوظ رکھنے کے لئے تعلیم گاہ کے لئے اس صحرائی مقام کا انتخاب کیا گیا ہے جہاں زمین بھی کافی ہے اور اپنی ضرورت کی حد تک سبزی ترکاریاں وغیرہ طلبہ و اساتذہ خود کاشت کر لیتے ہیں، دودھ، دہی، گھی کیلئے بھی مویشیوں کی پرورش کی آسانیاں یہاں ہمیں میسر ہیں، آب وہوا

[1] یہی منشی رام جی تھے جنہوں نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سوامی شردھانند کے نام سے شہرت حاصل کی۔ سیاسی کاروبار والوں کے لئے ان کا وجود ایک مستقل موضوع بحث ہونے کی حیثیت رکھتا ہو، لیکن مجھ جیسے ناکاروں کے لئے ان کے پہلے نام منشی رام کو سُن سُن کر خیال آتا تھا کہ "منشی" کا لفظ جو ٹھیٹ عربی لفظ ہے، انشار باب افعال سے اسم فاعل ہے، ایک ... اسی ہندوستان میں وہ بھی گذرا تھا کہ "رام" کے لفظ کے ساتھ عربی کے اس لفظ کو جوڑنے اور نام تک رکھنے میں مضائقہ محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اسی ہندوستان میں اب جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم دیکھ رہے ہیں ع "جو کچھ خُدا دکھائے اُسے ناچار دیکھنا"

آزاد ہندوستان کے سب سے پہلے وزیر اعظم کا نام بھی اسی تاریخی دور کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ ۱۲۔

کے لحاظ سے بھی شہری آبادیوں کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دینی چاہیئے اُن سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک بڑا کتب خانہ بھی گروکل کے قبضہ میں ہے اور شاید کوئی پریس بھی اسی احاطہ میں گروکل کا چل رہا تھا۔

بہر حال وہ کہتے جاتے تھے، اور فقیر سنتا جاتا تھا۔ چاہتا تھا کہ ایک عامی مسلمان سے زیادہ ان پر اپنے متعلق کوئی اثر پڑنے نہ دوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پرنسپل صاحب نے بھانپ لیا، کہ ہو نہ ہو مسلمانوں کا یہ کوئی مولوی ضرور ہے، ممکن ہے کہ میرے ہاتھ میں "طبقات ابن سعد" کی جو جلد تھی، اُس کو دیکھ کر اُن کا ذہن منتقل ہوا ہو۔ اُنہوں نے پھر اپنے کسی آدمی کو بلایا، اور کہا کہ اساتذہ کے درس کے کمروں میں ان کو لے جاؤ، لائبریری جاکر دکھاؤ، اور سب کچھ جب دیکھ لیں، تو ان کو اس مہمان خانہ میں جاکر ٹھیرا دو، جو محمڈن، (یعنی مسلمانوں) کے لئے مختص ہے۔ وہ آدمی بھی بڑا اچھا ملنسار آدمی تھا، پرنسپل صاحب سے رخصت ہو کر اُن کی غیر معمولی مہربانیوں کا شکریہ ادا کر کے اسی ملنسار آدمی کے ساتھ روانہ ہوا، مختلف کمروں کے پاس لیجا کر وہی بیچارا مجھے کھڑا کرتا، بتاتا کہ اس کمرہ میں فلاں مضمون کا درس ہو رہا ہے، انگریزی زبان تو لوگ استعمال نہیں کر رہے تھے۔ لیکن جس زبان میں پڑھا رہے تھے، اس کے اکثر الفاظ میرے لئے ناقابل فہم تھے، غالباً پنڈتائی، یا تلسی داس والی رامائن کی زبان میں پڑھائی ہو رہی تھی، اس وقت تک، رامائن سمجھنے کی قابلیت مجھ میں پیدا نہیں ہوئی تھی، اسی لئے ان اساتذہ کے لکچروں سے استفادہ نہ کر سکا۔ لائبریری پر بھی اجمالی نظر ڈال سکا بارہ بج چکے تھے، وہی ملنسار نیک دل آدمی مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک کمرے کے سامنے آیا، کمرہ کافی وسیع تھا، اور ساز و سامان سے لیس تھا، پلنگ نواڑ کے اُس میں بچھے ہوئے تھے، جس پر بستر بھی تھا، تخت بھی فرش سے آراستہ تھا، شاید ایک دو کرسیاں بھی تھیں، کمرہ کھول کر اسی میں گویا مجھے اُتار دیا گیا۔ پانی کا نظم بھی تھا وضو کر کے بیٹھا، شاید بیس پچیس منٹ گذرے تھے کہ اسی ملنسار نیک دل آدمی کو دیکھا ہاتھ میں ایک پرات لئے آرہے ہیں۔ اُس پرات کے ایک گوشہ میں کچھ پوریاں وغیرہ تھیں، اور چھوٹی پیالیوں میں کچھ ترکاریاں، کچھ آچار جیسی چیزیں تھیں، ساتھ ہی کچھ مٹھائیاں بھی۔ پرنسپل صاحب کی طرف سے میری ضیافت کا یہ نظم کیا گیا تھا۔

لوگوں نے کن کن غلط فہمیوں میں مجھے الجھانا چاہا تھا، لیکن جب واقعہ سامنے آیا تو شاید کسی عربی مدرسہ میں بھی خوش آمدید کے ان تماشوں کی توقع مشکل ہی سے کر سکتا تھا، وہ ملنسار آدمی بھی غیر معمولی طور پر میری مدارات میں خاص دلچسپی لیتا رہا، کھلا پلا کر اُس نے کہا کہ اب کچھ دیر آپ آرام کیجئے۔ پرات اپنے ساتھ لے گیا میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا، اور پلنگ پر دراز ہو گیا۔ اچانک اُس وقت خیال آیا کہ ارے آج تو جمعہ کا دن ہے، جمعہ کا خیال آتے ہی اندر ہی اندر تلملانے لگا۔ یہ تو یاد نہیں رہا کہ قیلولہ میں کچھ نیند بھی آئی یا نہیں۔ لیکن دو بجے کے قریب پلنگ سے اُٹھا وضو کیا، پانی گھڑے میں بھرا رکھا ہوا تھا اور اسی بند کمرے میں اب اسے خواہ میرا جنون خیال کیجئے، یا خبط ضرورت تو نہ تھی، لیکن کیا میں نے یہی کہ معتدل آواز میں اذان دی، اذان کے بعد تکبیر کہتے ہوئے بجائے جمعہ کی دو رکعت کے ظہر ہی کی چار رکعتیں ادا کیں دل میں یہی خیال تھا کہ اللہ کی اس سرزمین میں اللہ کا نام پکار تو دوں۔ پھر کون آئے گا، جو اللہ کا نام پکاریگا۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر پلنگ ہی پر لیٹے لیٹے طبقات کا مطالعہ کرتا رہا، اُس وقت ہلکی سی بارش بھی پندرہ بیس منٹ کے لئے اس علاقہ میں ہو گئی۔ یہاں تک چار بج گئے، اور عصر کی نماز بھی اس مہمان خانہ کے اسی کمرے میں اذان کے بعد ادا کر کے ایک نیا خیال ستانے لگا یعنی اب مجھے کیا کرنا چاہیئے کیا اس دن کو گروکل ہی کے احاطہ میں گذار دوں، یا وقت باقی ہے مغرب تک میں گنگا کے اس ساحل تک پہونچ جاؤں گا جہاں سے کشتی میں بیٹھ کر ہردوار پہونچ سکتا ہوں۔ میں نے ایک غلط اور قطعاً غلط فیصلہ کیا کہ رات یہاں بسر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس خیال کا غلبہ اتنا شدت پذیر ہوا کہ کمرے سے باہر نکل آیا، اپنے ملنسار گائیڈ سے مُلاقات ہو گئی۔ میں نے کہا کہ پرنسپل صاحب سے اس وقت کیا مل سکتا ہوں؟ بولا کیوں؟ میں نے کہا کہ اُن سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ اُس نے بھی سمجھایا کہ یہ وقت جانے کا نہیں۔

مگر واہ ری جوانی اور اس کا دیوانہ پن، اُس غریب کے سر ہو گیا آخر لے گیا پرنسپل صاحب بھی حیران تھے کہ اس جھٹ پٹے وقت میں واپسی کا خیال اور وہ بھی جنگل کی اس پگ ڈنڈی سے عجیب ہے راستہ میں متعدد نالے پڑتے ہیں۔ لیکن وہ وقت ہی اور تھا۔ اب تو پیدا ہونے کے ساتھ ہی تقریباً ہر ارادہ اور ہر خواہش سینہ ہی میں رہ جاتی ہے لیکن عہدِ شباب کے جن دنوں کا یہ قصہ ہے، وہ وقت ایسا تھا کہ کسی ارادے کو عزم کی اس قوت سے جُدا کرنا میرے لئے ناممکن تھا پرنسپل صاحب کی فہمائش بھی بیکار ثابت ہوئی، اور میں اُن سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ دل میں صرف ایک ہوس رہ گئی، یعنی چاہتا تھا کہ کچھ طلبہ سے باتیں کر کے اُن کی علمی صلاحیتوں کا کچھ اندازہ کروں۔ لیکن ایک پردیسی اجنبی آدمی کے لئے یہ اُمید ہی غلط تھی کہ طلبہ فوراً مجھ سے مانوس ہو جاتے۔ پرنسپل صاحب سے رخصت ہو کر جب چلنے لگا تو راستہ میں چند طلبہ پر نظر پڑی۔ مخاطب تو مخاطب کرنے کے بعد وہ ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کھل کر کسی مسئلہ پر اور وہ بھی علمی رنگ کے مسئلہ پر ان بیچاروں سے گفتگو کی اُمید ایک طفلانہ اُمید کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔ گروکل کے متعلق جو کچھ جاننا چاہتا تھا اجمالاً ان سے تو گو نہ واقف ہونے کا موقعہ مختصر ہی لیکن مل تو گیا۔ لیکن طلبہ کی علمی استعداد کا اندازہ نہ کر سکا۔ میرا خیال ہے کہ تحت الشعور اس جلد بازی میں کچھ دخل پیران دانا کی باتوں کو بھی تھا۔ اگر میرے دل میں پہلے سے اس قسم کے خیالات نہ ڈال دیئے جاتے، تو شب گزاری میں ظاہر ہے کہ حرج ہی کیا تھا میزبانی کے تجربات بھی اُمید سے زیادہ حوصلہ افزا تھے۔ لیکن ایک بات دل میں جب ڈال دی جاتی ہے، تو چاہا جائے یا نہ چاہا جائے کچھ نہ کچھ اثر اس کا ضرور نمایاں ہوتا ہے[1]۔

سو اتفاق سے کچھ دیر کے لئے اس علاقے میں ہلکی سی بارش بھی ہو گئی تھی، ابر کھل چکا تھا، آفتاب چمک رہا تھا۔ لیکن بارش کی وجہ سے درختوں سے قطرات ٹپکتے تھے، اسی حال میں گروکل کے احاطہ سے نکل کر جنگل والی پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ دونوں طرف گھنے جنگل تھے۔ ٹپ ٹپ آواز گرنے والے قطروں کی خشک پتوں سے آرہی تھی۔ دن ختم ہو رہا تھا، جوں جوں آفتاب کی روشنی دھیمی پڑتی چلی جاتی تھی، جنگل کا یہ سماں میرے لئے زیادہ بھیانک بنتا چلا جاتا تھا، خدا خدا کر کے ٹھیک اُس وقت جب سُورج کا زرد چکر افق میں غائب ہوا، میں اس ساحل تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی گیا۔ جہاں کشتی ملتی تھی، ابھی ساحل دُور تھا، لیکن نظر کے سامنے تھا اس لئے اضطراب کی کیفیت میں بھی کمی محسوس ہوئی، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ غروب کے بعد تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ کوئی قطرہ خشک پتے پر جنگل میں گرا اور بندے نے سمجھا کہ ہو نہ ہو کوئی درندہ، ریچھ، تیندوا وغیرہ میری طرف چلا آرہا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ تقریباً یہ نصف گھنٹہ جو اس حال میں جنگل کی اس پگڈنڈی میں گذرا، میری زندگی کا خاص تھا، بندہ صرف اپنے خدا کے سامنے تھا، یا خدا بندے کے سامنے گویا آ گیا تھا۔ حسبنا اللہ نعم الوکیل کا عملی تجربہ تھا، جس سے گویا گذر رہا تھا ساحل پر جب نظر پڑی تو تسلی ضرور ہوئی۔ لیکن دُور دُور تک نگاہوں کو دوڑاتا، آدم کی اولاد کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا مسلمان ہو، ہندو ہو، کالا ہو،

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ نفرت کے جذبات کا ردِ عمل بھی ہمیشہ نفرت ہی کی شکل میں ہوتا ہے شیخ اکبر محی الدین بن علی رحمۃ اللہ علیہ نے "فتوحات" میں اپنا ایک ذاتی تجربہ نقل کیا ہے، جوانی کے دنوں میں جب اپنے وطن اندلس میں وہ تھے اور شکار کا شوق حد سے زیادہ غالب تھا، لکھا ہے کہ ایک دفعہ سفر میں میرا گذر ایسے میدان میں ہو رہا تھا جس میں جنگلی گورخروں کی ایک ڈار چرنے میں مشغول تھی، باوجود شکاری ہونے کے اس وقت (باقی کالم ۲ پر)

(بقیہ کالم ۱) دل میں میں نے یہ طے کیا کہ کچھ بھی ہو جائے میں ان گورخروں پر حملہ نہ کروں گا، بیان کیا ہے کہ اپنے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا، بھالا میرے ہاتھ میں تھا گورخروں سے نزدیک ہوا، اتنا نزدیک ہو گیا کہ گویا اُن کی صفوں میں گھس گیا، بھالا اُن کے کان کے پاس سے چھو جاتا لیکن کسی قسم کی نہ وحشت اُن میں پیدا ہوئی نہ بھڑکے، مزے سے چرنے میں مشغول تھے، تا آنکہ میرے ذکر چاکر جو پیچھے آ رہے تھے، اور شکار کرنے کے خیال کو انہوں نے دل سے نہ نکالا تھا، جونہی کہ گورخروں کی نظر اُن پر پڑی، چوکڑی بھرتے ہوئے وہ ہوئے شیخ نے بیان کیا ہے کہ نفرت اور عداوت کے خیال سے عداوت پیدا ہوتی ہے قرآنی آیت ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (بھلے طریقہ سے بُرائی کا مقابلہ کر کے دیکھو، تم پاؤ گے کہ اچانک وہی جس کے درمیان اور تمہارے درمیان دشمنی ہو وہی گرمجوش دوست بنا ہوا ہے) لوگ ہر ہر معاملات کو سُلجھانے میں

گورا ہو، عالم ہو، جاہل ہو، کوئی ہو، مگر دل آدمی کو ڈھونڈھتا تھا خوب یاد آتا ہے کہ اسی موقعہ پر "انسان" کے متعلق ذہن منتقل ہوا کہ یہ انس کے لفظ سے ماخوذ ہے، میرا دل انس کو ڈھونڈھتا تھا خواہ کسی چرواہے، گڈریے ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو، لیکن آسمان بھی تھا، زمین بھی تھی، درخت بھی تھے، سامنے ہمالیہ کی سربفلک چوٹیوں کا سلسلہ تھا۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن میرا دل جس سے اس وقت انس حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ صرف انسان تھا۔ دُور ہی سے دیکھا کہ ساحل پر کشتی کے ملاح چلے آرہے ہیں، اب تو پُر اُمید ہو کر تیز تیز قدم بھرتے ہوئے چاہا کہ کشتی والوں تک پہونچ جاؤں لیکن اُف میری مایوسی کا وہ عالم ابھی کشتی سے چہار فرلانگ دور ہی تھا کہ دیکھا کشتی والوں نے کشتی کھول دی۔ شاید کچھ مُسافر اُس پار کھڑے تھے اُن ہی سے بھر کر کشتی روانہ ہو گئی۔ تاریکی گویا پھیل رہی تھی، میں نے سر پکڑ لیا۔ اب کیا ہو گا۔ میں نے خُدا کی نعمت کا انکار کیا تھا۔ گروکل کے مہمان خانہ میں شب گذاری کے ارادہ کو خواہ مخواہ ترک کیا تھا۔ اب اس کی یہ سزا تھی کہ گنگا کے ایک جنگلی نالے کے کنارے جس کی ایک طرف گھنا جنگل، دوسری طرف اُونچے اونچے خوفناک پہاڑ، اور تیسری طرف دریا کا نالہ، رات بھر اسی ٹاپو میں یا اللہ کیسے گذاروں گا۔ مغرب کا وقت تو آہی چکا تھا، اب تو جو کچھ ہوتا ہے، ہو کر رہے گا، نماز تو پڑھ ہی لینی چاہئے، نماز پڑھ لی، دُعا رکیا کرتا کہ اس وقت میرا سارا وجود دعا رہی دعا رہنا ہوا تھا۔ سلام پھیر کر رسمی دعا رکے لئے ہاتھ اٹھا ہی رہا تھا، کہ اسی سمت سے جس کی طرف صبح کو چنڈی دیوی کی طرف تیر تھ کرنیوالوں کو دیکھا مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ بیلوں کو ہنکاتے ہوئے اسی طرف سے لوگ ساحل کی طرف آرہے ہیں۔ اتنے میں بیلوں پر اور ان کے ہنکانے والوں پر بھی نظر پڑی۔ مصلی کو اُٹھا اور اُن ہی کی طرف بھاگا۔ خیال یہی تھا کہ رات اگر گذارنی پڑے گی تو ان ہی کے ساتھ گذرے گی۔ جب بیلوں کی قطار کے قریب ہوا تو ایک آدمی جو آگے آگے تھا اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ مُسافر ہوں پار جانا چاہتا ہوں۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر بولا کہ پریشانی کی کیا بات ہے

ہم لوگ بنجارے ہیں، نمک لے کر جنگلی دیہاتوں میں گھومتے اور بیچتے ہیں، کشتی والے کو اپنی خاص علامت کے ذریعہ ہم بلائینگے وہ آئے گا۔ آپ ہمارے ساتھ پار ہو جائیں گے۔ سارا اضطراب ساری سراسیمگی، امن و عافیت سے بدل گئی۔ میرے اس اضطراب اور پریشانی میں بالکل ممکن ہے کہ نوعمری کے ساتھ میری اجنبیت کو بھی دخل ہو، اس علاقہ سے میں قطعاً غیر مانوس تھا جس رنگ میں اس ماحول کو میرا دل پا رہا تھا، ہو سکتا ہو کہ واقعیت اس میں کم شریک ہو، اجنبی نامانوس جگہ میں یوں بھی آدمی کو وحشت ہوتی ہے، اور یہ مقام تو بہرحال وحشت کا تھا ہی، جگہ بھی وحشت کی، وقت بھی وحشت کا۔ اور سب سے پریشان کن کیفیت تنہائی کی تھی۔ بارے ارحم الراحمین کی رحمت نے دستگیری کی، اور بنجاروں کو لینے کے لئے کشتی واقعی واپس ہوئی، بیلوں اور بنجاروں کے ساتھ ہم بھی کشتی میں سوار ہو گئے، اور جس ساحل پر ہردوار کی آبادی ہے اُس پر پہونچ گئے، سرا پہونچے، بستر کا کرایہ دو آنے ادا کئے اُس کو بغل میں لئے اسٹیشن پہونچے، اور گروکل کا ایک افسانہ اپنے حافظہ میں لئے ہوئے ہم دیوبند واپس ہو گئے۔ تھا تو میری زندگی کا یہ سفر صرف ایک دن کا، لیکن عمر کا اکثر و بیشتر حصّہ جس کا سیر و سیاحت ہی میں بسر ہوا، جب سوچتا ہوں، تو نتائج اور فوائد کے لحاظ سے اس ایک دن کو بہت سے دنوں سے بھاری پاتا ہوں۔ وہاں سے واپس ہو کر میرا دماغ اور میرا دل کیا کیا سوچتا رہا، اس کی داستان طویل ہے، اور سفر سے اس کا تعلق بھی نہیں ہے، سفر کی حد تک اِس سفرنامہ کو اسی پر ختم کرتا ہوں +

تنقید و تبصرہ

(سیّد محمّد ازہر شاہ قیصر)

عام فہم تفسیر اُردو!

تفسیر سورۂ یوسف قیمت عه، تفسیر سورۂ یونس عہ،
تفسیر سورۂ کہف عہ، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل قیمت عہ،
ملنے کا پتہ:۔ دینی بک ڈپو اُردو بازار، جامع مسجد۔ دہلی

ہم اس نظریہ کو بر بنائے تجربہ صحیح سمجھتے ہیں کہ انسانیت صرف کتابوں کے مطالعہ اور کتابی زندگی سے نہیں آتی بلکہ اس کے لئے قدرت کے تکوینی اسرار پر بقدر ظرف غور و فکر، ارض و سما کے تغیر پذیر حالات کے گہرے مطالعہ، روزانہ کے واقعات و معاملات کے مشاہدے اور مخلوقات و موجودات کے افعال و خواص سے واقفیت ضروری ہے اور اُسے مختصر لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ انسانیت کی تکمیل اور علم کی آخری حد کتاب اور کائنات کا مطالعہ ہے۔

مولنا احمد سعید صاحب دہلوی اپنی اس خصوصیت میں یگانہ اور فرد ہیں کہ ممدوح نے اپنی سیاسی اور قومی زندگی کی طویل مدت میں ذہن انسانی کی مختلف بیماریوں، اُن بیماریوں کے اسباب اور ان کے صحیح علاج کو دریافت فرمایا ہے، انہوں نے خواص کی مجلسوں اور عوام کے ہجوم میں اُن شکوک و شبہات کو پہچانا جو نوک خار اور نوک شمشیر بنکر ان کے دلوں میں چبھ رہے ہیں اور جنہوں نے مذہب کی عظمت الہامی تعلیمات کی سچائی، رُوحانی زندگی کی برتری، اخلاقی اور ایمانی ضابطوں کا انہیں منکر اور باغی بنا دیا ہے۔

مولنا نے سالہا سال کے اس مطالعہ کے بعد ضروری سمجھا کہ اُردو زبان میں قرآن مجید کا ایک ترجمہ اور مختصر تفسیر ترتیب دی جائے جس میں مقتضیات عصر اور ضروریات زمانہ کی پُوری رعایت رکھی گئی ہو، ساتھ ہی مسلک سلف کے تحفظ کے لئے احتیاط کامل، اظہار واقعات کے لئے ارشادات لطیف اور مضمرات و مجملات قرآنی کو کھولنے اور مرادات قرآنی کے ایضاح و تفصیل کا پُورا سامان جمع کردیا گیا ہو، مولنا کے ترجمہ و تفسیر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ خود مولنا کا علم و فکر اسلاف و اکابر کے چراغ زندگی سے مستنیر ہے اور اُن کا ذہن اُن حدود کو پہچانتا ہے جہاں سے تفسیر بالرائے کے پہاڑی علاقے شروع ہوتے ہیں، اور ادھر آپ موجودہ دور کی دماغی الجھنوں، فکری انتشار، عقیدے کے کج پن، اور خیالات کی بے ترتیبی و گمراہی پر بھی باخبر ہیں۔ اِس لئے ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انکی یہ قرآنی خدمت پوری دُنیا کو قرآنی تعلیمات پر مطمئن کر سکتی ہے۔

دینی بک ڈپو دہلی کی طرف سے ہمیں مولنا کی چار قرآنی تصانیف تفسیر سورۂ یوسف، تفسیر سورۂ یونس، تفسیر سورۂ کہف اور تفسیر سورۂ بنی اسرائیل، موصول ہوئی ہیں، چاروں کتابیں لطائف قرآنی کا ذخیرہ اور حکمتِ ایمانی کا گنجینہ ہیں۔ ایک صفحہ پر قرآن مجید کا متن اس کے نیچے صاف، و سلیس ترجمہ اور مقابل کے صفحہ پر موجز، مختصر اور جامع تفسیر ہے۔ خُدا کرے مولنا اپنی زندگی کے اس بہترین کارنامے کو جلد از جلد پُورا کر سکیں۔

ہمارے بزرگ حضرت مولنا محمد طیب صاحب نے اس ترجمہ و تفسیر کے متعلق ایک عالمانہ اور مبصرانہ تعارف نامہ تحریر فرمایا ہے، جو ان میں سے ایک کتاب کے ساتھ شامل ہے۔ اس سلسلہ تفسیر کے صحیح تعارف کے لئے یہ تحریر بہت کار آمد ہے۔

ناشر سے ہمیں یہ شکایت ہے کہ چاروں کتابوں میں کاغذ معمولی اور کتابت و طباعت اوسط درجے کی کرائی گئی ہے، یہ ذخیرہ اِس قابل تھا کہ اسکی طباعت و اشاعت پر کما ینبغی محنت اور کما حقہٗ اہتمام کیا جاتا۔

جوامعہ الکلم لسید الامم!

ترجمہ الحاج محمد اسحاق ضیائی۔ ضخامت ۲۱۵ صفحات

کتابت وطباعت متوسط، کاغذ رف، قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ:۔ سرائے بو اہیر حسینی علم حیدر آباد دکن

حیدر آباد ماضی قریب میں علم و تہذیب کا ایک خاص مرکز تھا، اب وہاں علوم وفنون کے وہ قدیم سانچے ٹوٹتے پھوٹتے جا رہے ہیں مگر کام کرنے والے لوگ ان مشکل حالات میں بھی برا، بھلا تھوڑا بہت کام کر ہی رہے ہیں۔

عبد اللہ محمد بن سلامۃ القضاعی المصری پانچویں صدی ہجری کے ایک شافعی المذہب عالم تھے سلاطین فاطمیین کے زمانہ میں آپ مصر میں مرتبۂ قضائت پر فائز تھے۔ تاریخ ابن خلکان کے بیان کے مطابق حدیث میں آپ خطیب بغدادی کے شاگرد تھے۔ طلب علم میں انہوں نے حجاز اور قسطنطنیہ کا سفر بھی کیا۔ آپ کی وفات سنہ ۴۵۴ھ میں ہوئی اور قرافہ میں مدفون ہوئے۔ قضاعی نے "الشہاب فی الحکم والامثال والآداب" کے نام سے حدیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ہزار کلمات حکمت جمع کئے، اُن میں سے اسناد اور راویوں کے نام حذف کر دیئے۔ تاریخ ابن خلکان، تاریخ دمشق مصنّفہ ابن عساکر، حسن المحاضرہ للشیخ جلال الدین سیوطی میں آپ کے حالات اور اس مجموعۂ احادیث کا ذکر ملتا ہے، مگر ہر مورخ نے کتاب کا نام کچھ تصرف اور تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مختلف مصنّفین نے آپ کی اس کتاب کی شرح اور تلخیصات کیں۔ اُن ہی میں سے ایک شرح الماء المعین ہے جو حسن بن ہبۃ اللہ نامی ایک یمنی سردار وسید قوم کی ہے شارح کا انتقال سنہ ۵۸۹ھ میں ہوا۔

حیدر آبادی مترجم نے ترجمہ کے لئے "الماء المعین" کا ایک نسخہ سامنے رکھا ہے۔ اس ترجمہ میں کم وبیش بارہ سو احادیث اور پھر احادیث قدسیہ اور ادعیہ ماثورہ کا ترجمہ آگیا ہے۔ ترجمہ نہایت صاف اور شستہ ہے مگر کئی خامیاں اصل کتاب سے چل رہی ہیں جو اس کی شروح، تلخیصات اور تراجم میں بدستور موجود ہیں:۔

(۱) اسناد اور راویوں کے نام حذف کر دینے سے کتاب کے استناد واعتماد میں حدیث کے فنی ضوابط کے لحاظ سے بڑا جھول پیدا ہو گیا ہے یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہے کہ کونسی حدیث صحیح ہے۔ اور کونسی ضعیف۔

(۲) اسناد اور راویوں کے نام حذف کر دیئے گئے تھے تو کم ازکم مشکوٰۃ کے طرز پر مستند کتابوں کا حوالہ ضروری تھا۔

(۳) احادیث کا یہ ذخیرہ عنوانات کے ماتحت مرتب کیا جاتا تو اس کی منفعت بھی بڑھ جاتی اور ترتیب میں سلیقہ پیدا ہوتا۔

اور یہ تینوں کام حیدر آبادی مترجم بھی کر سکتے تھے۔ مولٰنا فضل اللہ بہاری نے اس ترجمہ کے سلسلے میں مصنف کی علمی امداد کی ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں موصوف کی مدد سے یا از خود اگر ان ضرور توں پر بھی توجہ دی جائے تو مناسب ہوگا۔

قہر کی آندھی اور اللہ میاں کی اونٹنی!

از ابن احمد قرنی ایم اے۔ دونوں رسالے ۴۸-۴۸ صفحات کے ہیں۔ کتابت طباعت اچھی ہے، ٹائٹل آرٹ پیپر پر بلاک سے چھاپا گیا ہے، ہر رسالہ کی قیمت ۶/ ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ فلاح انسانیت، لوشیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ کراچی

اس سلسلہ کی چار کہانیوں پر دو ڈھائی سال پہلے رسالہ دار العلوم میں تبصرہ نکل چکا ہے، بچّوں کی ذہنیت اور اخلاق کو خراب کر دینے والی کہانیوں کے مقابلہ میں دینی اور تاریخی، کہانیوں کا یہ سلسلہ یقیناً مفید ہے، پہلے رسالہ میں حضرت ہودؑ کی رسالت اور تبلیغ اور ان کی قوم عاد کی نافرمانی، سرکشی اور بربادی کی داستان اور دوسرے میں عاد کی بعد کی قوم ثمود، اور ثمود کے لئے پیغام خداوندی لانے والے پیمبر حضرت صالحؑ کے حالات، قوم ثمود کی صناعی وکاریگری، اُن کے

دار العلوم سے اہلحدیث طلبہ کا اخراج

اخبارات کی غیر ذمہ دارانہ اطلاعات پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کا توضیحی بیان!

۱۳ ر جمادی الاولی ۱۳۷۳ھ کو دار العلوم سے انتظامی وجوہات کے تحت طلبائے اہلحدیث کا اخراج کیا گیا۔ اسے سامنے رکھ کر افسوس ہے کہ بعض اخبارات نے رجماً بالغیب یا طلبائے مخرجین کے کسی بیان پر دار العلوم، اس کے مسلک، اور ملک میں اس کے سیاسی موقف حتیٰ کہ علمائے دیوبند کے سلف و خلف پر الزامات و ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دی اور اس خالص انتظامی معاملہ کو جسے کسی بھی مسلکی اختلاف سے تعلق نہیں فرقہ وارانہ تعصب کا رنگ دیکر طبقاتی منافرت پھیلانے کا پردہ ڈال دیا اور اس پر پھر علمائے دیوبند کو اتفاق و اتحاد کی نصیحت اور فرقہ وارانہ کشیدگیوں سے بچتے رہنے کی دعوت بھی دی۔ حالانکہ طلبہ کا داخلہ اور خارجہ تعلیمی اداروں کے نظام میں کوئی غیر معمولی حادثہ یا اہم سانحہ نہیں۔ ہر ادارہ میں اس قسم کے تغیرات اور واقعات پیش آتے ہیں جنہیں مسلکی تفرق و اختلافات کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، ورنہ دار العلوم سے حنفی المذہب طلبہ کا اخراج ہو ہی نہیں سکتا درحالیکہ اس سے ..... زیادہ تعداد میں حنفی طلبہ کا اخراج بھی عمل میں آتا رہا ہے جس کو مسلکی اختلافات یا اتحاد سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

دار العلوم دیوبند نوے (۹۰) سال کے عرصے سے اپنی تعلیمی اور اصلاحی جد و جہد میں مصروف ہے۔ اس نے اپنے اساتذہ کرام استاذ الہند حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی دہلویؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ قدس اللہ اسرارہم کے نقش قدم کو مضبوطی سے تھام کر مسلک اہلسنت والجماعت اور مذہب حنفی کے مطابق دینی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور وہ اسی طریقہ کو حق سمجھ کر اسی کی روشنی میں کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت کرتا رہا۔ نیز اس کے ساتھ ہی وہ امت کو فروعی اختلافات کے جھگڑوں میں ڈالنے سے ہمیشہ گریزاں ہی رہا۔

کچھ عرصے سے سننے میں آ رہا تھا کہ دار العلوم میں ایک جماعت طلبائے اہلحدیث (غیر مقلدوں) کی داخل ہوئی ہے اور وہ مخفی طور پر احاطۂ دار العلوم میں اپنے مسلک کی اشاعت کر رہی ہے، اکابر و اسلاف دار العلوم بلکہ ائمہ پر زبان طعن بھی کھول رہی ہے، جس سے قدرتی طور پر طلبہ میں بے چینی پیدا ہو رہی ہے، طلبہ کے مسلک اور اخلاقی رویہ پر برا اثر پڑ رہا ہے، اور ساتھ ہی ان کا یہ رویہ دار العلوم کے نظام تعلیم و تربیت کے لئے مضر ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ زمانہ فروعی اختلافات کے ہوا دینے اور فروعی جزئیات کے معیار سے تشدد یا سخت گیری کا نہیں ہے طرح دیجاتی رہی، اور اس قسم کی خبروں سے کوئی اثر نہیں لیا گیا۔ لیکن جب یہ حالات حدود سے متجاوز ہونے لگے اور ان کے ایک فتنہ کی صورت اختیار کر لینے سے طلبہ میں نزاعات کی تخم ریزی ہونے لگی اور اس بارہ میں اندر اور باہر سے اطلاعی تحریرات اور خطوط وغیرہ پیاپے موصول ہوئے جن میں اس فتنہ کی تفصیلی خبریں دی گئی تھیں تو معاملہ اس حد پر نہ رہا کہ طرح دیکر سکوت اختیار کیا جائے۔ اس لئے حضرات اساتذہ کی اجتماعی رائے سے چند اساتذہ پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا، تاکہ اس کی رپورٹ اور جانچ کے نتیجہ کی روشنی میں بصیرت کے ساتھ کوئی اصلاحی قدم اٹھایا جائے۔ کمیشن نے تقریباً ایک ہفتے کی محنت اور کاوش سے اپنی تحقیقات مکمل کی۔ معاملہ کے تمام پہلوؤں کی تنقیح کر کے ہر ہر جزو کے بارہ میں ثبوت فراہم کیا، اور ۱۳ ر جمادی الاولی ۱۳۷۳ھ کو اپنی رپورٹ مجلس اکابر و اساتذہ میں پیش کی۔ رپورٹ پڑھی گئی اور اس سلسلہ میں دوران تحقیقات میں کمیشن کو جو تحریریں طلبہ یا باہر کے حضرات

کی موصول ہوئیں سُنائی گئیں۔ مجلس کی اس رپورٹ پر اور متعلقہ ثبوت سے وہ خبریں جو عرصے سے کانوں میں پڑ رہی تھیں صحیح ثابت ہوئیں اور واضح ہوا کہ یہ فتنہ مضر حد تک پہونچ چکا ہے، اگر اسکی اصلاح و تلافی نہ کی گئی تو نہایت مضر نتائج برآمد ہوں گے، اس لئے مجلس نے باتفاق رائے طے کیا کہ :-

(۱) جو طلبہ ثبوت و شواہد کے علاوہ خود بھی اپنے غیر مقلد ہونے کے برملا مدعی اور معترف ہیں اور وہ اس اشتباہ مسلک اور نزاع باہمی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، نیز طلبہ میں اُن کی تعصب آمیز ریشہ دوانیاں اور مسلک عدم تقلید کی اشاعت جاری ہے انہیں دار العلوم سے خارج کردیا جائے کہ اس کے سوا طلبہ میں سکون کی کوئی صورت نہیں۔

(۲) جو طلبہ اپنے غیر مقلد اور شریک فتنہ ہونے سے منکر ہیں مگر معتد بہ شہود کے بیانات اُن کے خلاف ثابت ہیں نیز خود اُن کے اپنے بیانات میں بھی الفاظ مشتبہ اور تہافت بیان پایا جاتا ہے انھیں بھی نمبر (۱) ہی کے طلبہ کے ساتھ لاحق رکھا جائے۔

(۳) جو طلبہ انکاری بھی ہیں اور ان کے خلاف شہادتیں اور ثبوت بھی معتد بہ نہیں ہیں ان کا معاملہ مزید تحقیقات کا مقتضی ہے۔ تکمیل تحقیقات کے بعد ان کے بارہ میں کوئی آخری فیصلہ کیا جائے۔ اس صورت حال کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں کا خطوط کے ذریعہ مسلکی طور پر رنج و غم بلکہ غم و غصہ کا اظہار اور کچھ کا خوشی یا تائیدی کلمات کا اظہار قطعاً بے محل اور حقیقت معاملہ سے بے تعلق باتیں ہیں۔ دار العلوم ایک خاص مسلک کا تربیتی ادارہ ہے سیاست کا پلیٹ فارم نہیں اس لئے اس کے اساتذہ میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تعلیم و تربیت کے سلسلوں میں معلم و مربی کے علم و دین پر اعتماد شرط اول ہے اساتذہ کے علم و دین پر نکتہ چیں اور طعنہ زن رہ کر کسی مستفید کے لئے نہ استفادہ ممکن ہے نہ افادہ۔ سیاسی اسٹیج پر اتفاق و اجتماع کے لئے مسلم ہونا بھی شرط نہیں لیکن مذہبی تربیت کوئی ایسا اسٹیج نہیں جہاں مسلم و کافر محق و مبطل اور خاطی و مصیب کے صحیح و غلط کی نمائندگی اور کھپت ہو وہ عقیدہ و عمل ہی ایک لائن کا ہوگا، تو استفادہ و افادہ کی ہم آہنگی اور تربیت کی نتیجہ خیزی قائم رہیگی، ورنہ بد اعتقادی، بے اعتمادی اور نزاع و جدال کے سوا کوئی حاصل نہیں نکل سکتا فروعی اختلاف کو جو صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین تک میں تھا۔ امت کے شقاق و افتراق سے تعبیر کیا جانا یا اس کا حوالہ دیکر کسی طبقہ کو دوسرے طبقہ سے بدظن اور بر انگیختہ بنانا وقت اور دین کے تقاضوں کے خلاف ہونے کے علاوہ طلبہ کے انتظامی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ دار العلوم فروعی اختلافات کے جھگڑوں اور طبقاتی کشیدگیوں سے پہلے بھی الگ رہا اور اب بھی بدستور الگ ہے۔ تربیتی قیود و شرائط سے جو قدرتی ہیں اس کی روایتی وسیع دامانی پر کوئی دھبہ نہیں آسکتا یہ بے اصل اور افترا ہے کہ اساتذۂ دار العلوم درس میں اہلحدیث کو سب و شتم کرتے ہیں۔ تبرا نہ اس جماعت کا شیوہ ہے اور نہ ادب اتباع کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی ہے جذبات کے اظہار پر اگر کبھی کسی جذباتی جملہ کا اظہار ہوا ہو اور واقعہ بھی ہو تو اس سے جماعتی مسلک کا کوئی تعلق نہیں، اور نہ وہ اس پر حجت ہو سکتا ہے۔

بہر حال مسئلہ طلبہ کے انتظامی معاملات کا ہے جس کی حقیقت اُوپر عرض کردی گئی۔ مسلکی اختلافات یا ملک کے سیاسی معاملات کا نہیں نہ اس قصہ کا مسلکی معاملات سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہ ان پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ہر دائرہ کی حدود الگ الگ ہیں اُن ہی کے دائرہ میں رہ کر اس کے معاملات کو دیکھنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں جو موافق و مخالف مکتوب موصول ہوئے میرے خیال میں اُن سب کے جواب میں یہ سطور بالا کافی ہوں گی۔ وباللہ التوفیق +

بقیہ تنقید و تبصرہ

شاندار محلات، اُن کے پر شوکت تمدن، پھر ان کے طغیان و ضلالت اور کفر و عدوان، حضرت صالح کی اونٹنی، اونٹنی کے قتل اور قتل کے بعد عذاب خداوندی کی آمد پر مختصر گفتگو کی گئی ہے، ان دونوں قوموں کے مقامات و اماکن کو بھی موجودہ جغرافیائی نقشہ میں متعین کیا گیا ہے، زبان سادہ اور شیریں ہے اقوام گذشتہ کے حالات میں اسرائیلی روایات کا کافی ذخیرہ خلط ملط ہو کر رہ گیا ہے ان اساطیر کہنہ کو بیان کرتے وقت اسرائیلی روایات کی نشاندہی ضرور کردینی چاہئے، مفسرین نے اول تو اسرائیلیات سے بالکل قطع نظر کیا ہے اور یہ چیزیں آگئی ہیں تو ان کی نشاندہی ضرور کردی ہے اور یہی

طریقہ احتیاط اور ذمہ داری کو متقاضی بھی ہے + (سید محمد ازہر شاہ قیصر)

Regd. No. A. 804